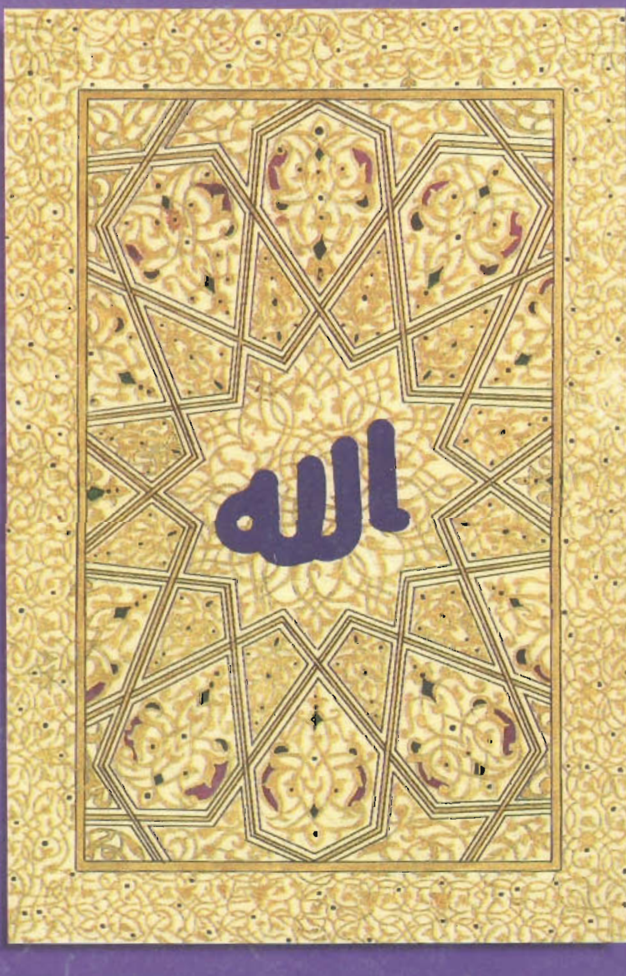
ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اکتوبر ۱۹۹۸ء

مُدیر
خورشید احمد



اِدارۂ ترجمان القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی و محترمی ---------------------- السلام علیکم ورحمتہ اللہ

میں آپ کو جماعت اسلامی پاکستان کے تاریخی اجتماع عام میں شرکت کی دعوت دیتا ہوں ۔

اس بار انشاء اللہ یہ سہ روزہ عظیم الشان اجتماع عام مورخہ ۲۳' ۲۴' ۲۵ اکتوبر ۹۸ء بروز جمعہ ' ہفتہ ' اتوار فیصل مسجد اسلام آباد میں منعقد ہو گا ۔ جس میں انشاء اللہ جماعت اسلامی پاکستان کے ارکان و کارکنان اور ممبران کے علاوہ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے تین لاکھ مرد و خواتین شرکت کریں گے ۔ اجتماع میں دنیا بھر کے اسلامی تحریکوں کے رہنما بھی شریک ہوں گے ۔ یہ اجتماع پاکستان کے لاکھوں لوگوں کو اپنے مالک حقیقی اور حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ گہرا تعلق جوڑنے اور پاکستان میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد کو نتیجہ خیز بنانے کا باعث بنے گا۔

ملک کے موجودہ حالات سے پوری قوم دل برداشتہ ہے ۔ سابقہ اور موجودہ حکومتوں نے معاشی ' سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے عوام کو مایوس کر دیا ہے انشاء اللہ العزیز یہ اجتماع عام ملکی سالمیت ' قومی یکجہتی اور منظم و باکردار متبادل قیادت فراہم کرنے کا یقین و حوصلہ عطا کرے گا۔ فیصل مسجد اسلام آباد میں جماعت اسلامی پاکستان کے زیر اہتمام بسائی جانے والی لاکھوں مرد و خواتین کی بستی اخوت و محبت ' ایثار و قربانی ' نظم و ضبط اور ہمت و جرات کا نمونہ بن کر پوری دنیا میں امت مسلمہ اور پاکستان کی عزت و افتخار کا باعث بنے گی ۔

آپ خود بھی اس اجتماع میں شرکت فرمائیں اور اپنے اہل خانہ ' عزیزوں و دوستوں کو بھی ہمراہ لائیں ۔

میں انشاء اللہ مورخہ ۲۳ اکتوبر ۹۸ء بروز جمعہ فیصل مسجد اسلام آباد میں آپ کا استقبال کروں گا ۔

والسلام

(قاضی حسین احمد)

امیر جماعت اسلامی پاکستان

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد
نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۲۵ | اکتوبر ۱۹۹۸ء، جمادی الثانی ۱۴۱۹ | عدد ۱۰

ترتیب

○ اشارات
نفاذ شریعت — خورشید احمد — ۳
○ حکمت مودودیؒ
جدید مسائل، شریعت کے راہ نما اصول — ۲۹
○ فہم قرآن
فریضہ جہاد۔ حکمت اور مقاصد — سید قطب شہید — ۳۳
○ تزکیہ و تربیت
لایعنی باتوں سے پرہیز — مولانا اشرف علی تھانویؒ — ۳۹
○ دعوت و تحریک
انقلاب کا راستہ — خرم مراد — ۴۳
○ اسلام اور مغرب
اسلامی تحریکیں۔ خدشات اور امکانات — قاضی حسین احمد — ۵۷
○ رسائل و مسائل
شادی کے باوجود علیحدہ رہنا — ڈاکٹر انیس احمد — ۶۵
سب سے اچھی دعا — محمد یوسف اصلاحی — ۷۰
○ کتاب نما — ۷۵
○ مدیر کے نام — ۸۳

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور
فون: ۷۸۴۴۶۰۵
فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور
فون: ۷۵۸۷۹۶۱ ۔ ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے
زر سالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے
بنگلہ دیش، ایران ۴۵۰ روپے
مشرق وسطی، یورپ
مشرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

جنگ آزادی کی حقیقی نوعیت

اندازہ کیجیے کہ اس "جنگ آزادی" کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ اس کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ میرے قید خانے کا رفیق مجھ سے کہتا ہو کہ آؤ میں اور تم دونوں مل کر جیلر سے لڑیں اور ہم دونوں اپنی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں کاٹ پھینکیں۔ اگر معاملہ یہی ہوتا تو مجھ سے بڑھ کر کون احمق ہوتا کہ ایسے کارِخیر میں اس کا ہاتھ بٹانے سے انکار کرتا لیکن یہاں صورت حال کچھ اور ہی ہے۔ میرا رفیق زنداں اس تدبیر میں ہے کہ جیلر کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لے لے اور اپنے ہاتھ پاؤں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی میرے ہاتھ پاؤں میں ڈال کر مجھے اپنا قیدی بنا لے۔ وہ مجھ سے تو کہتا ہے کہ آؤ اس قید و بند سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جیلر سے لڑیں۔ مگر جیلر کے ساتھ یہ معاملہ طے کرتا ہے کہ حضور مجھے برقنداز بنا دیں' جیل کا انتظام حضور کے حسب منشا ہو گا اور قیدیوں کو میں قابو میں رکھوں گا۔ اس طرح جو کچھ اختیارات اسے جیلر سے ملتے جاتے ہیں ان سے کام لے کر وہ اپنی قید کے طوق و سلاسل اتار کر مجھے کستا چلا جاتا ہے۔ اور مزید غضب یہ ہے کہ جیلر صاحب تو نرے جیلر تھے مگر یہ ہمارے رفیق زنداں صاحب جواب برقنداز بنے ہیں' ان کو مردم خوری کا لپکا بھی ہے۔ یہ مجھے فقط اپنا قیدی ہی نہیں بنانا چاہتے بلکہ میرے گوشت اور خون کو آہستہ آہستہ اپنا جزو بدن بھی بنا لینے کی فکر میں ہیں۔ اب اگر میری عقل ماری گئی ہے تو میں ان کے ساتھ ضرور تعاون کروں گا تاکہ یہ میری مدد سے جیلر پر دباؤ ڈال کر اور زیادہ اختیارات حاصل کریں اور زیادہ آسانی سے مجھے نوش جان فرما سکیں۔ اور اگر میری ہیے کی آنکھیں [دل کی آنکھیں] پھوٹ چکی ہیں تو میں جیل کی کوٹھڑی میں بے فکر بیٹھا ان برقنداز صاحب کی ترقی کو دیکھتا رہوں گا۔ اور اگر جیل کی زندگی نے مجھے پست ہمت اور ذلیل بنا دیا ہے تو میں بوڑھے جیلر کی خدمت میں دوڑا ہوا جاؤں گا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کروں گا کہ حضور کا دم سلامت رہے' جب تک آپ جیتے ہیں اس وقت تک تو آپ ہی جیل کا انتظام فرمائیں' جب خدانخواستہ آپ کا وقت آن پورا ہو گا' اس وقت دیکھی جائے گی' جس کی قید بھی قسمت میں لکھی ہو گی بھگت لیں گے۔ لیکن اگر میں عقل و خرد سے کچھ بھی بہرہ رکھتا ہوں اور میری رگوں میں ابھی شرافت کا بھی خون باقی ہے تو میں ہمت کر کے اٹھوں گا اور جیل کی دیواریں اپنے ہاتھ سے توڑنے کی کوشش کروں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کوشش میں جیلر یا برقنداز کی گولی کا نشانہ بن جاؤں گا' تو بہت اچھا' مجھے اس کو گوارا کر لینا چاہیے۔ قیدی کی زندگی سے' اور برقنداز کی غذا بننے سے لاکھ درجے بہتر ہے کہ لڑ کر مارا جاؤں۔ اس مردانہ کام میں دور ہی کا سہی مگر یہ امکان بھی ہے کہ مجھے اپنی کوشش میں کامیابی نصیب ہو جائے اور میں اپنے مکار رفیق زنداں سے کہہ سکوں کہ برادرم! جیل کی ہوا بھول جاؤ اور سیدھی طرح شریف ہمسایہ بن کر رہو۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش' سید مودودیؒ' ترجمان القرآن' جلد ۱۳' عدد ۲' ۳' ۴' شعبان' رمضان' شوال' ۱۳۵۷ھ ' اکتوبر' نومبر' دسمبر ۱۹۳۸ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

نفاذِ شریعت

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

خورشید احمد

اس وقت ملک و ملت کے تقریباً ہر طبقے میں اور ہر میدان کار میں چند بنیادی مسائل پر بحث و گفتگو کا سلسلہ گرم ہے۔ نجی محفلوں‘ سیاسی اجتماعات اور اخبارات و رسائل کے صفحات سے لے کر پارلیمنٹ کے ایوانوں تک ہر جگہ یہی مسائل زیر بحث ہیں۔ ان میں امن و امان کی زبوں حالی‘ اقتصادی پابندیاں اور معاشی بحرانوں کا طوفان‘ صوبائی اور علاقائی عصبیت کی زہرناکی‘ فرقہ واریت کے عفریت کی کارفرمائیاں‘ خارجہ سیاست میں پاکستان کی تنہائی‘ بھارت کے جارحانہ عزائم کی افزونی‘ امریکہ کی بے وفائیاں اور ظلم کاریاں‘ ایٹمی صلاحیت کو محدود اور معدوم کرنے کے لیے بیرونی دباؤ اور اندرونی قلابازیاں اور سی ٹی بی ٹی کے جال کے لیے ریشہ دوانیاں سرفہرست ہیں۔

اس پس منظر میں تحریک اسلامی نے قوم اور اس کی قیادت کو یہ سوچنے کی دعوت دی کہ ان تمام مسائل کے حقیقی اور دیرپا حل کے لیے جس فکر و نظر کے انقلاب اور جس مضبوط اور ہمہ گیر عملی ملی اقدام کی ضرورت ہے وہ نفاذ شریعت ہے۔ ابھی یہ تحریک شروع ہی ہوئی تھی کہ مرکزی حکومت کی طرف سے "دستور کی پندرھویں ترمیم" کابل سامنے آگیا۔ اس میں ایک طرف ملت کے دیرینہ مطالبے اور اس کی دلی آرزو یعنی قرآن و سنت کو ملک کا بالاترین قانون بنانے کا اعلان دستور کی زبان سے کرنے کے عزم کا اظہار ہوا تھا‘ مگر ساتھ ہی دوسری طرف نفاذ شریعت کی مشکلات کے نام پر مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں قوت و اقتدار کے غیر معمولی ارتکاز اور دستور میں ترمیم دستور کے مجوزہ ضابطہ اور طریقہ سے دستور کا حلیہ بگاڑنے کا شرانگیز سامان بھی کیا گیا تھا۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شریعت اور نفاذ شریعت جیسا غیر متنازع معاملہ

بھی ایک متنازع مسئلہ بن گیا ہے اور ساری توجہ شریعت کی کلید سے زندگی کے مسائل حل کرنے سے ہٹ کر سیاسی اور قانونی موشگافیوں ہی پر نہیں، بلکہ نیتوں کے فتور اور انفرادی اور گروہی اقتدار کی شرمناک جنگ پر مرکوز ہو گئی ہے۔ ایک طبقہ جو خواہ اپنی تعداد اور عوامی بنیاد کے اعتبار سے کتنا ہی قلیل اور غیر ثقہ کیوں نہ ہو، مگر سیاسی اثرات، ذرائع ابلاغ میں اپنی قوت اور بیرونی تائید و معاونت کے اعتبار سے بڑا زور آور ہے، کھل کر اسلام، اسلامی ریاست، شریعت کی بالادستی اور اجتماعی زندگی میں دین کے کردار ہی پر حملہ آور ہو گیا ہے۔

ان حالات میں ضرورت ہے کہ اس شور و غوغا میں اصل مسئلے کو گم ہو جانے سے بچایا جائے، ہر جماعتی، گروہی اور ذاتی اختلاف، مفاد اور تعصب سے بالا ہو کر نفاذ شریعت کی حقیقت کو سمجھا جائے اور اسے حقیقت بنانے کے لیے جس طرز فکر، طریق کار اور عملی اقدام کی ضرورت ہے، اس کی نشاندہی کی جائے تاکہ شریعت، جو نام ہے دین اسلام اور اس کے دیے ہوئے طرز فکر و عمل کا، اور جس کی امتیازی خصوصیت ہی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی ہے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ منزل مقصود تک لے جانے والا (حنیفیہ)، نرمی اور آسانی پیدا کرنے والا (سمحہ) سہولت بخش (سہلہ) منور، تابناک (بیضاء) اور اتنا واضح ہے کہ اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے (لیلھا کنھارھا)، عملاً نافذ ہو۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم ان چند بنیادی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرنا چاہتے ہیں جو اس بحث میں بڑے بڑے جغادری اور بااثر افراد کی طرف سے بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ پھیلائی جا رہی ہیں۔

سب سے افسوس ناک اور باغیانہ رویہ ملک کی سیکولر اور غیر مسلم لابی کا ہے۔ یہ لابی کھل کر اسلامی ریاست اور شریعت کی بالادستی کے خلاف محاذ آرائی میں پیش پیش ہے اور بڑے تند اور تلخ انداز میں جارحانہ طور پر حملہ آور ہے۔ اس میں پیپلز پارٹی کی سربراہ سے لے کر انسانی حقوق اور اقلیتوں کے حقوق کا نام لینے والے منظم گروہ تک سب ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ بے نظیر صاحبہ نے کھل کر اپنے مذموم لبرلزم کی علم برداری کا دعویٰ کرتے ہوئے نفاذ شریعت کی ہر کوشش کو مذہبی انتہا پرستی، اور جنرل ضیاء الحق مرحوم کی ذریت کی ریشہ دوانی قرار دیا ہے۔ پاکستان میں حقوق انسانی کے نام پر ہنگامہ برپا کرنے والا پورا طائفہ دائیں بائیں ہر طرف اپنی توپیں داغ رہا ہے۔ عیسائی قیادت تلوار بے نیام کر کے میدان میں کود پڑی ہے کہ ہم مسلمانوں کو ان کے اپنے ملک میں ان کی اپنی شریعت نافذ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے! اس کے ساتھ ہی ساتھ مغربی ذرائع ابلاغ اور پالیسی ساز جمہوریت اور اکثریت سے فیصلوں کے سارے دعووں کے باوصف اس معمولی سی اقلیت کی آواز میں آواز ملا رہے ہیں اور اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

ایک دوسرا طبقہ ذرا دوسرے انداز میں گرم فرما ہوا ہے۔ اسے کھل کر سیکولرازم، لبرلزم اور لادینیت کی

بات کرنے کی تو ہمت اور جرات نہیں۔ اس لیے اس نے ایک خیالی خطرے کا ہوا اٹھایا ہے' یعنی اس کا نشانہ نام نہاد مذہبی پیشوائیت' تھیوکریسی اور "ملا کا اسلام" ہے اور "اقبال اور قائداعظم کے اسلام" کا نام لے کر یہ نفاذ شریعت کی راہ کھوٹی کرنا چاہتا ہے۔

حکومت کے پیش کردہ دستوری ترمیمی بل میں جو نقائص اور خامیاں ہیں' وہ لازماً قابل اصلاح ہیں اور ان تبدیلیوں اور اصلاحات کے بغیر وہ قوم کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ قرآن و سنت کی بالادستی سے متعلق دستوری ترمیم لانے والوں کی نیتوں اور ان کے اپنے مقاصد اور سیاسی مصالح کی جو بھی صورت ہو' خاصے وقیع حقائق شبہات کو جنم دے رہے ہیں۔ لیکن ملک کے عوام اور اس کی اسلامی قیادت کو ان پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے اصل سوال--- یعنی شریعت کی بالادستی کے قیام کی تحریک کو' خواہ وہ کسی بھی سمت سے آئے اور کسی بھی شکل میں ہو' تقویت پہنچانے اور اس مسئلے کو دستوری اور قانونی اعتبار سے ایک بار مکمل طور پر طے کرا لینے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنا اور تحریک پاکستان کے حقیقی مقاصد کو پورا کرنا اور ان قربانیوں کا حق ادا کرنا ہے جو پاکستان کو دور حاضر میں اسلام کی حقیقی تجربہ گاہ بنانے کے لیے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں نے دی تھیں اور جس کے لیے تحریک اسلامی نے ۱۹۴۸ میں مطالبہ نظام اسلام کی آواز بلند کی اور اس دن سے لے کر آج تک شریعت کی بالادستی اور دین حق کی اقامت کے لیے جدوجہد کی ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے بندے کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے مالک و آقا اور رب کو تسلیم کرے یا نہ کرے اور اپنے لیے اللہ کی بندگی یا اس سے بغاوت کا راستہ اختیار کرے (اور یہی معنی ہیں لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کی ضمانت کے) تو بلاشبہ ہم یا کوئی مسلمان ملک انسانوں کو ان کے اس حق سے محروم نہیں کر سکتے۔ لیکن دو باتیں صاف ہونی چاہییں:

جہاں کفر اور انکار کی راہ اختیار کرنے والوں کو اپنے ذاتی عقیدے اور عمل کی آزادی کا اختیار حاصل ہے' وہاں انھیں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو' جو اپنے عقیدے اور ایمان کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی قرآن و سنت کی بالادستی کی بنیاد پر استوار کرنا چاہتے ہیں' اس عمل سے روکیں اور اس کے لیے بیرونی' سیاسی اور تہذیبی قوتوں کی معاونت سے زور آوری کا ہر حربہ استعمال کریں۔ سیکولر لابی جو دوسروں کو "مذہبی فسطائیت" کا طعنہ دیتی ہے' خود بدترین "سیکولر فسطائیت" کی مرتکب ہو رہی ہے۔ اس محدود اقلیت کو' اپنے سارے اثر و رسوخ اور وسائل ابلاغ پر قدرت کے باوجود' یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے روکے۔ ان

حضرات کو اپنی بات پر قائم رہنے اور اس کے اظہار کی آزادی کا حق ہے اور ہم اس کا دفاع کریں گے۔ لیکن ان کا بھی فرض ہے کہ اپنی رائے اور ترجیحات کو ملت اسلامیہ پاکستان کی عظیم اکثریت پر مسلط کرنے سے احتراز کریں۔ جمہوریت کو اصل خطرہ اس آمرانہ اور جارحانہ ذہنیت سے ہے اور اسے قابو میں رکھنا خود جمہوریت کے فروغ اور استحکام کے لیے ضروری ہے۔

خود مسلم معاشرے میں جو کمزوریاں اور نظریاتی تنوع بہت سے تاریخی اسباب کی بنا پر پیدا ہو گیا ہے اس کو برداشت کرنا ضروری ہے۔ افہام و تفہیم، تعلیم و تعلم اور بحث و مباحثہ اور مکالمے کے ذریعے مختلف علیہ اور مختلف فیہ کا تعین ہو سکتا ہے۔ اتفاق کے وسیع دائرے میں تعاون ہو اور اختلاف کا احترام بھی اصول کے معاملات میں یکسوئی اور استقامت کی طرح ضروری سمجھا جائے۔ مسلم معاشرہ آزادی اور رواداری کی بنیاد پر وجود میں آتا اور ترقی کرتا ہے۔ کثرت میں وحدت اور حدود اللہ کے دائرے میں تنوع اس کی امتیازی شان ہے۔ اس کی مثال اس باغ کی سی ہے جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوں ؏

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

سارے اختلافات کے باوجود نرمی اور توسع ہمارا شعار رہا ہے اور آج بھی اسی میں بقا اور ترقی کا راز مضمر ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جن چیزوں پر عظیم اکثریت یکسو ہے، جن کو وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھتی ہے اور جن پر اپنی اخروی زندگی کی کامیابی کا یقین رکھتی ہے، ان کے بارے میں محض کسی اختلافی نقطہ نظر کے دباؤ میں عمل نہ کیا جائے۔ جس طرح نظریاتی اقلیت کے حقوق ہیں، اسی طرح نظریاتی اکثریت کے بھی حقوق ہیں اور ان دونوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔

یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان ہونے اور قرآن و سنت پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ ایک شخص اسلام قبول کرتا ہے یا نہیں، یہاں تک تو اس کو آزادی حاصل ہے، لیکن اسلام کو قبول کرنا ایک ذمے داری ہے۔ ہر ذمے داری کی کچھ بنیادی تقاضے ہوتے ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انسان کی یہ آزادی کچھ میدانوں میں محدود ہو جاتی ہے اس لیے کہ اسلام نام ہی اس عہد کا ہے کہ انسان اللہ کو اپنا رب، خاتم الانبیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول، ہادی، آقا اور رہبر، اور اسلام کو اپنا دین اور طریق زندگی تسلیم کرلے اور اس پر راضی اور مطمئن ہو جائے۔ "جزوی مسلمان" یا "نیم مسلمان" کا کوئی تصور دائرہ اسلام میں نہیں اور عقل بھی اسے گوارا نہیں کرتی۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ (البقرہ ۲: ۲۰۸) "اے وہ لوگو، جو ایمان لائے ہو، دائرہ اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے، اور شیطان کے طریقے پر عمل پیرا نہ ہو"۔

اسلام کی کچھ تعلیمات اور احکام کو ماننا اور کچھ کا انکار کر دینا، اللہ کی اطاعت اور بندگی کا راستہ نہیں

ہے۔ اسلام کے شعوری اقرار کے بعد بندہ اپنی آزادی کو اللہ کی حدود کا پابند کر لیتا ہے اور پھر صرف ان حدود کے دائرے میں اپنے اختیار کو استعمال کرتا ہے۔ یہ تحدید وہ اپنی مرضی سے قبول کرتا ہے لیکن اس تحدید کے بعد یہ حق اسے نہیں رہتا کہ جس چیز کو چاہے اختیار کرے اور جسے چاہے رد کر دے۔ یہ آزادی نہیں تناقض، دو رنگی اور منافقت ہے جس کی اسلام ہی نہیں کسی بھی نظام میں گنجایش نہیں ہو سکتی اور جس کے نتیجے میں بجز کش مکش اور صلاحیتوں اور وسائل کے ضیاع کے کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کا فیصلہ ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (یوسف ۱۲: ۴۰) "فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے"۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف ۷: ۳) "لوگو، جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو"۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدہ ۵: ۴۴) "اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں"۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○ (النساء ۴: ۶۵) "نہیں (اے محمدؐ) تمھارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کر لیں"۔

یہ ہے سچے مسلمانوں کی روش۔ اسی کا تقاضا ہے کہ شریعت کو بالادستی حاصل ہو۔ ماننے والوں کے لیے صحیح راستہ یہی ہے اور نہ ماننے والوں کو حق نہیں کہ ماننے والوں کو اپنے ایمان اور عقیدے کے مطابق اپنی زندگی کی شاہراہ تعمیر کرنے سے روکیں۔

یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ اسلام ایک اور صرف ایک ہے اور وہ اللہ کا بھیجا ہوا دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دکھایا ہوا راستہ ہے۔ یہ مکمل نظام حیات ہے اور اس میں زندگی کے تمام مسائل اور معاملات کا حل بھی موجود ہے اور انسانی معاشرے میں تغیر و تبدل اور اسے ترقی و ارتقا کی جو حقیقی ضروریات ہیں ان کا بھی پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس فریم ورک میں اطاعت، آزادی، اختلاف اور تنوع ہر ایک کا اپنا مقام ہے لیکن یہ سب کچھ اس کے اپنے اصول اور ضابطوں کے مطابق ہے۔ جہاں اسلام زندگی کے بنیادی معاملات کے بارے میں واضح اور دو ٹوک رہنمائی دیتا ہے وہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے لیے بھی خود اپنے نظام میں کافی و شافی گنجایش اور مواقع رکھتا ہے۔ البتہ وہ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرتا جو اس کے

نظام اقدار کی ضد اور نفی کرنے والی یا ان کو مجروح کرنے والی ہو۔ خُذْمَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدَر (جو صحیح اور صحت مند ہے اسے قبول کرلو اور جو ناموافق ہے اسے ترک کردو) کا اصول اس عمل کو ہمیشہ جاری و ساری رکھتا ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کے اعلان کے بعد زمان و مکاں کے تمام تغیرات اور وسعتوں کے باوجود آج تک اسلام ایک ہی رہا ہے۔ نہ عربوں کا اسلام کوئی الگ ہے اور نہ پاکستان، ایران، ترکی، یورپ، امریکہ اور افریقہ کے مسلمانوں کا۔ اسی طرح پہلی صدی کا اسلام چوتھی صدی کا اسلام اور بیسویں صدی کا اسلام اپنا کوئی الگ الگ وجود نہیں رکھتے۔ اسلام تو ایک ہی رواں دواں دریا کی مانند ہے جس میں پانی کے نئے دھارے ملتے بھی رہتے ہیں اور اس کی نوعیت اور سمت پھر بھی ایک جیسی ہی رہتی ہے خواہ ابوحنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل، مالک، غزالی، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ کا تصور اسلام ہو یا اقبال اور قائداعظم کا تصور۔ یہ سب اسی ایک اسلام کے علم بردار تھے اور قرآن و سنت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے باہر یا اس میں غیراسلام کی آمیزش کے رونما ہونے والے کسی نظرثانی شدہ اسلام کے نہ قائل تھے اور نہ داعی۔ ان پر اس سے بڑا ظلم کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ ان کے اسلام اور ملا کے نام نہاد اسلام کو دست و گریباں کیا جائے اور اقبال اور قائداعظم کا نام لے کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی شریعت سے فرار کی راہیں تلاش کی جائیں۔

علامہ اقبال کی تو پوری زندگی کا مشن اور پیغام ہی یہ تھا کہ:

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصلِ سُنت جز محبت ہیچ نیست
ملت از آئینِ حق گیرد نظام
از نظامِ محکمے خیزد دوام
قدرت اندر علم او پیدا ستے
ہم عصا و ہم یدِ بیضا ستے
با تو گویم سِرِّ اسلام است شرع
شرع آغاز است و انجام است شرع
ہست دینِ مصطفیؐ دینِ حیات
شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
تا شعارِ مصطفیؐ از دست رفت
قوم را رمزِ بقا از دست رفت

رہے قائداعظمؒ اور ان کے حقیقی رفقا (نواب زادہ لیاقت علی خاں، نواب اسماعیل خاں، بہادر یار جنگ،

سردار عبدالرب نشتر' مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ) تو تحریک پاکستان کے دوران اور قیام پاکستان کے بعد کم از کم دو سو ایسے واضح بیانات تو صرف قائداعظمؒ کے موجود ہیں جن میں اسلام کو اس جدوجہد کی منزل اور قرآن' اسوہ رسولؐ' اسلامی قوانین اور اسلامی تہذیب و تمدن کی بالادستی کے قیام کو پاکستان کا مشن اور ہدف قرار دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود پوری ڈھٹائی کے ساتھ ان کی دو ایک تقاریر کو سیاق و سباق سے کاٹ کر ان کے تصورات کی غلط تصویر پیش کرنے کی مذموم سعی کی جاتی ہے۔ یہ روش ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی ہے اور تمام حقائق کے سامنے آ جانے کے باوجود ایک گروہ وہی رٹ لگائے جا رہا ہے۔ اس سے خود اس گروہ کی بدنیتی بے نقاب ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان حضرات کا مقصد قائداعظم کے پورے تصور کو پیش کرنا نہیں' بلکہ اپنے مقاصد کے لیے چند جملوں کو استعمال کرنا ہے۔ ایسی صریح بددیانتی پر اٹھائی جانے والی دیوار ریت کی دیوار ہی ہو سکتی ہے جو کسی تعمیر میں کام نہیں آ سکتی۔

کراچی میں ۱۹۴۳ میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا تھا:

وہ کون سی چٹان ہے جس پر ملت کی عمارت قائم ہے اور وہ کون سا لنگر ہے جو سفینہ ملی کو تھامے ہوئے ہے؟ مسلم انڈیا کے سفینہ ملی کا مستحکم لنگر عظیم المرتبت کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جائیں گے ویسے ویسے ہماری یہ وحدت بھی بڑھتی جائے گی۔ ایک خدا' ایک کتاب' ایک رسولؐ' ایک قبلہ اور ایک قوم!

سرحد مسلم طلبہ کی فیڈریشن کو جو پیغام قائد نے ۱۹۴۵ میں دیا' وہ یہ تھا:

پاکستان کا مطلب صرف آزادی و حریت کا حصول نہیں ہے بلکہ اسلامی نظریے کا تحفظ بھی ہے جس کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ قیمتی تحفے اور بیش بہا خزانے ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔

اسی سال عید کے پیغام میں فرمایا:

بجز ان لوگوں کے جو بے خبر ہیں ہر شخص آگاہ ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کا ہمہ گیر و بالاتر اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ مذہبی بھی' معاشی و معاشرتی بھی' دیوانی بھی' فوجداری بھی' تجارتی بھی' عدالتی بھی اور تعزیری بھی---- یہ ضابطہ زندگی کی ایک ایک چیز کو باقاعدگی اور ترتیب عطا کرتا ہے۔

سبی دربار کے موقع پر ۱۴ فروری ۱۹۴۸ کو قائد نے عہد کیا:

میرا ایمان ہے کہ ہم سب کی نجات ان سنہری قواعد اور زریں احکام کی پیروی میں مضمر ہے جو ہمارے رہن سہن اور معاملات زندگی کو درست رکھنے کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا کیے ہیں۔ آیئے ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں اور تصورات پر استوار کریں۔ خدائے قادر و مطلق نے ہمیں سکھلایا ہے کہ مملکت کے تمام امور میں ہمارے فیصلے بحث و تمحیص

اور مشاورت کی رہنمائی میں ہوں۔

ہمیں بتایا جائے کہ قرآن و سنت کی واضح شاہراہ اور اسلام کے ضابطہ قانون سے ہٹ کر اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا اسلام کون سا ہے؟ یہ ان دونوں بزرگوں پر تہمت اور خلط مبحث کی ایک شرمناک کوشش ہے۔ شریعت میں کوئی ابہام نہیں اور ہر مسلمان اس شریعت کا علم بردار اور طالب ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنی امانت کی شکل میں دی ہے۔ شریعت جو ہماری آزادی' دنیوی فلاح اور اخروی کامیابی کی ضامن ہے' جو تمام انبیا کی سنت رہی ہے اور جسے اپنی آخری اور مکمل شکل میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت تک پہنچایا اور آج جس کی امین امت مسلمہ ہے۔ کامیاب اب وہی ہو گا جو اس راستے پر گامزن ہو۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○ (الاعراف ۷: ۱۵۷)

(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر' نبی اُمّیؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے' بدی سے روکتا ہے' ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے' اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے' وہی فلاح پانے والے ہیں۔

شریعت اور اس کے نفاذ کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کی نوعیت اور حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور جو فرق شریعت یا اسلامی قانون اور مغربی قانون میں ہے' اسے نظر میں رکھا جائے۔ لغت کے اعتبار سے "شرع" اور "شریعت" کے معنی راستے کے ہیں۔ پرانے زمانے میں گھریلو استعمال کے لیے پانی' محلے یا دیہات کے کنویں' تالاب' نہر یا چشمے وغیرہ سے لایا جاتا تھا اور انسانوں اور مویشیوں کے بار بار وہاں آنے جانے سے ایک ایسا راستہ بن جاتا تھا جو سیدھا' مختصر' کشادہ' واضح اور صاف ہوتا تھا۔ اسی راستے کو عربی لغت میں شریعت کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ سیدھا' کشادہ اور واضح راستہ جو کسی بستی کے لوگوں کو پانی کے ذخیرے اور مصدر و ماخذ تک پہنچا دے۔ خود قرآن میں یہ لفظ بار بار استعمال ہوا ہے اور

اصطلاحی اعتبار سے شریعت سے مراد زندگی گزارنے کا وہ راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں کے لیے مقرر فرمایا اور جو دین کے احکام اور اصولوں پر عمل پیرا ہونے اور انسانی زندگی کی ان اصولوں کے مطابق عملی تشکیل کرنے کا واحد راستہ ہے۔

قرآن و سنت اس شریعت کے اصل اور بنیادی مآخذ ہیں۔ اس کے ایک حصے کا تعلق عقائد' افکار اور احساسات سے ہے اور دوسرے کا انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے۔ فقہ یا اسلامی قانون' شریعت کے اس حصے کا نام ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اسلامی تشکیل سے بحث کرتا ہے۔ فقہائے کرام فقہ کی یہی تعریف کرتے ہیں: العلم بالاحکام الشریعه العملیه عن ادلتها التفصیلیة یعنی فقہ وہ علم ہے جس کے ذریعے شریعت کے عملی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جاتا ہے۔ شریعت انسان کی عملی زندگی کے کم و بیش ہر پہلو کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اس کے احکام جہاں ایک طرف امر و نہی' حلال و حرام' مستحب اور مکروہ کی نشاندہی کرتے ہیں' وہیں حدود کی اس صف بندی کے ساتھ ساتھ مباح اور انسانی آزادی کے میدان کو بھی واضح اور نمایاں کر دیتے ہیں۔ اور یہی وہ میدان ہے جس میں ہر دور میں اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کے ذریعے نئی قانون سازی کی جاتی رہی ہے اور کی جاتی رہے گی۔

شریعت کے ایک حصے کا نفاذ ہر فرد اور ادارہ خود اپنی ذاتی مرضی اور داعیہ (initiative) پر کرتا ہے۔ اس طرح ایک خود کار نظام (self-executing system) کے ذریعے شریعت مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رچی بسی ہوئی ہے۔ عبادات و مناکحات میں معاملات کا ایک بڑا حصہ آ جاتا ہے۔ لیکن شریعت کا ایک حصہ وہ ہے جسے نافذ کرنے کے لیے معاشرے اور ریاست کی اجتماعی قوت درکار ہوتی ہے۔ یہی وہ حصہ ہے جس کے لیے آج کے دور میں دستور' قانون' ریاستی مشینری اور ضابطہ کار اور عدالتی نظام کو شریعت کے مقاصد اور احکام کا خادم اور کارندہ بنانا ضروری ہے۔

اسلامی قانون بیک وقت ایک خالص مذہبی' نظریاتی اور روحانی قانون ہی نہیں بلکہ ملکی اور عدالتی قانون بھی ہے۔ دوسری تہذیبوں اور مذاہب میں مذہبی قانون اور ملکی اور عدالتی قانون میں فرق کیا گیا ہے۔ مذہبی قانون بالعموم فرد کا ذاتی معاملہ سمجھا گیا اور اس کے نفاذ کو بھی اس کے فہم و ارادہ اور ضمیر پر چھوڑ دیا گیا۔ ریاستی اور عدالتی قانون صرف دنیاوی معاملات سے متعلق رہا اور اس کا انحصار رسم و رواج' بادشاہ کے حکم یا کسی بالاتر مقتدر یا مقننہ کے فیصلہ اور عدالت کے فیصلے کی نظیر پر رہا۔ اسلامی قانون میں وحدت' ہم آہنگی اور ہمہ گیری ہے۔ یہ قانون محض عبادات اور اللہ اور بندے کے تعلق تک محدود نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کا تعلق انسانوں سے اور فرد کا معاشرے' اجتماع اور ریاست سے تعلق بھی اس کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ اسلام کا قانون شخصی' معاشی' دیوانی' تعزیری' بین الاقوامی تمام دائروں پر محیط ہے۔ یہ عبادات سے لے

کر، خاندانی زندگی، معاشی تگ و دو، عمرانی معاملات، جرم و سزا، جنگ و صلح، غرض ان سب کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔

ایک مذہبی قانون ہونے کی حیثیت سے یہ ہر مسلمان کے ایمان کا معاملہ ہے اور اس پر عمل اس کے ایمان اور عقیدے کا تقاضا ہے۔ اس لیے قانون محض جبر اور قوتِ قاہرہ (coercive power) کی علامت نہیں بلکہ ایمان کا تقاضا، دل کی پکار، زندگی کی آرزو اور اجتماعی زندگی کا ادب بن جاتا ہے۔ اس کا نفاذ صرف ڈنڈے اور پولیس کے ذریعے نہیں بلکہ ضمیر کی آمادگی اور رب کی طاعت گزاری کے جذبے سے عبارت ہے۔ بلاشبہ پولیس اور عدالت کا بھی ایک مقام ہے لیکن جو چیز اسلام کے قانون کو منفرد درجہ دیتی ہے وہ اندر کی آواز اور باہر کے قانون کی ہم آہنگی اور ایک دوسرے کو تقویت دینے کی صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قانون پر پولیس کے پہرے اور مخبروں کے خوف سے کہیں زیادہ ضمیر کی خلش اور آخرت کی کامیابی کے جذبے سے عمل ہوا ہے۔ رات کی تاریکیوں اور تنہائیوں میں بھی اس پر عمل درآمد کا جذبہ ویسا ہی قوی ہوتا ہے جیسا دن کی روشنی اور محتسب کی موجودگی میں۔ اور جرم کے ارتکاب کے بعد توبہ ہی نہیں بلکہ پاکی کے حصول کے لیے "مجرم" خود سزا کا طالب بن جاتا ہے۔

جہاں اسلامی قانون کی یہ روح ہے، وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شریعت اپنے نفاذ کو محض ضمیر اور فرد کے ذاتی جذبے پر نہیں چھوڑتی، بلکہ انسانی فطرت اور معاشرے کی ضروریات کو سامنے رکھ کر ریاست کی شیرازہ بندی کے واضح احکام دیتی ہے، نظام امر قائم کرتی ہے، انتظامی مشنری وجود میں لاتی ہے، پولیس اور عدالت کے نظام کو قائم کرتی ہے اور اس طرح اندرونی قوت اور جذبے کی تکمیل بیرونی قوت اور نظام کے ذریعے کرتی ہے۔ ریاست اپنے تمام اداروں کے ذریعے ایک طرف تلقین، تعلیم اور بہتر نمونہ کا اہتمام کرتی ہے تو دوسری طرف ریاستی قوت اور عدالتی اداروں کے ذریعے قانون توڑنے والوں کی گرفت اور معاشرے کو جرم اور ظلم سے پاک کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔ دین اور ریاست ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بن جاتے ہیں۔ سیکولر ریاست اور اس کے تمام ادارے دین کی رہنمائی سے آزاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور دین ریاست اور معاشرے کے وسائل سے محروم رہتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ اسلام ایک بنیاد ہے جس پر مسلمانوں کی زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور حکومت ایک نگہبان اور محافظ ہے۔ اگر کسی عمارت کی بنیاد نہ ہو تو وہ کمزور رہتی ہے اور گر جاتی ہے اور اگر کسی عمارت کا کوئی محافظ اور نگہبان نہ ہو تو وہ ضائع ہو جاتی ہے، اس کو لوٹ لیا جاتا ہے یا اس پر دوسرے قابض ہو جاتے ہیں۔

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ:

- شریعت پوری زندگی کے لیے راہ عمل ہے۔
- قرآن و سنت اور ان کی روشنی میں مستنبط کیے ہوئے احکام ہی مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔
- یہ شریعت زندگی کے تمام امور پر حاوی ہے۔
- دنیوی قوانین کی طرح یہ محض ریاست کی قوت قاہرہ کے آگے سرتسلیم خم کرنا نہیں ہے بلکہ یہ قانون، ایمان و ضمیر کی پکار کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
- اندرونی داعیہ کے ساتھ ساتھ ریاستی، انتظامی اور عدالتی نظام کا خود شریعت کے ماتحت ہونا اور اس کے نفاذ کے عمل میں شرکت اور معاونت کے لیے مثبت اور موثر کردار ادا کرنا، اس نظام کا حصہ ہے۔
- شریعت کے نفاذ کا عمل ایمان اور ضمیر کی بیداری، تعلیم و تلقین کے نظام، معاشرے کے آداب و روایات اور قانون کی قوت، ان سب کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ نہ محض اخلاقی تلقین اور نہ محض جبر و قوت کا استعمال۔

مندرجہ بالا عوامل کا ساتھ ساتھ موثر ہونا شریعت کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔

یہ عمل ہر فرد سے دل کی گہرائیوں سے اور آخرت کی کامیابی کے جذبے سے سرشار ہو کر شرکت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت، ریاست اور اس کے تمام اداروں کے لیے بھی لازم کرتا ہے کہ وہ تعلیم و تلقین اور اچھی مثال کے ساتھ ساتھ نیکی کا حکم اور برائیوں کے روکنے کا کام انجام دیں۔ حق دار کو اس کا حق پہنچانا اور ظالم کو ظلم سے روکنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز اور روزے کا اہتمام--- بلکہ نماز تو ہے ہی اس لیے کہ برائیوں سے روکے (اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ)۔ اور روزے کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ متقی بنیں اور قانون کی پاس داری کریں (لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ)۔

شریعت کے نفاذ کا کام بڑا منفرد اور بابرکت ہے۔ اس میں قانون اور اس کی حقیقی اسپرٹ دونوں کا ساتھ ساتھ اہتمام ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عمل میں فرد، عوام، نظام تعلیم، ذرائع ابلاغ، اجتماعی اداروں اور حکومت سب کی شرکت ضروری ہے۔ البتہ دو وجوہ سے حکومت کا کردار سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے اور وہ یہ ہیں:

اولاً، آج کی ریاست ایک ہمہ گیر ادارہ بن گئی ہے جو ملک اور معاشرے کے وسائل کے بڑے حصے پر تصرف کے اختیارات رکھتی ہے۔ اس لیے جب تک یہ وسائل شریعت کے تابع اور اس کے نفاذ کے لیے استعمال نہ ہوں تبدیلی نہیں آسکتی۔

ثانیاً، مسلم معاشرہ صدیوں سے انتشار، اضمحلال اور غلامی کے بعد نئی زندگی کی تعمیر کے لیے سرگرداں ہے۔ صدیوں میں جو ادارے قائم ہوئے تھے اور جو اسلامی نظام کے لیے لنگر کا کام کر رہے تھے، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ تعلیم کا ایک لادینی نظام دو صدیوں سے قوم پر مسلط ہے اور اس کے نتیجے میں وہ کیفیت واقع ہو گئی ہے جسے اقبال نے یوں ادا کیا تھا۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

غیر اسلامی اور مغربی دنیا سے درآمد شدہ ادارے اور انتظامی در و بست مسلم معاشرے پر بزور ٹھونسے جا چکے ہیں۔ ان حالات میں تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فرد کی کوششوں کے ساتھ معاشرہ، ریاست اور اس کے تمام ادارے ظلم اور باطل سے نجات اور حق اور معروف کے قیام میں مکمل طور پر شریک نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ صرف انفرادی کوششیں بارآور نہیں ہو رہیں۔ نجی طور پر خیر کے فروغ اور بدی کے مٹانے کے لیے جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ بہت غنیمت ہے اور اس کے اچھے اثرات بچشم سر دیکھے جا سکتے ہیں، مگر مطلوبہ تبدیلی کے لیے وہ کافی نہیں۔ پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ میں اس کش مکش اور اس کے برے نتائج کو دیکھا جا سکتا ہے۔ زندگی کو اس تناقض (contradiction) اور تصادم سے پاک کیے بغیر ہم اپنے انسانی اور مادی وسائل کو صحیح صحیح استعمال نہیں کر سکتے اور مطلوبہ نتائج رونما نہیں ہو سکتے۔

آج مسئلہ صرف انفرادی خطا اور بے راہ روی نہیں اجتماعی فساد اور منظم ظلم ہے۔ اس کی بھی یہ کیفیت ہے کہ گویا زمین و آسمان بگاڑ اور فساد سے بھرے گئے ہیں (ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ)۔ ان حالات میں اجتماعی قوتوں کو تعلیم و تلقین، مظلوم کی داد رسی، حق دار کو حق پہنچانے اور ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے استعمال کیے بغیر شریعت کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ شریعت روحانی اور اخلاقی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انصاف کا اجتماعی نظام قائم کرنا چاہتی ہے۔ جب تک معاشرے سے ظلم اور فساد دور نہیں ہو جاتے، غربت اور افلاس کا خاتمہ نہیں ہوتا، مجبور اور مظلوم قوی نہیں بن جاتے اور منہ زور اور ظالم قابو میں نہیں کر دیے جاتے---- شریعت کے اہداف حاصل نہ ہو سکیں گے۔ اور یہی وہ میدان ہے جس کی اصلاح کے لیے ریاست اور اس کی اجتماعی قوتوں کو اسلام کے لیے مسخر کرنا ضروری ہے تاکہ قرآن کے الفاظ میں انسانوں کے لیے انصاف اور عدل قائم ہو سکے (لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ)۔

سوال یہ ہے کہ اس منزل کی طرف پیش قدمی کیوں نہیں ہو پاتی؟ اصل کمی، کسر اور بگاڑ کہاں ہے؟ شریعت کے نفاذ کی راہ میں اصل رکاوٹیں کیا ہیں اور ان کا سدباب کیسے ممکن ہے؟

جیسا کہ ہم نے اوپر نشاندہی کی شریعت نے اپنے نفاذ کے لیے چار راستے اختیار کیے ہیں۔ یعنی (۱) ایمان اور اندرونی محرک (۲) تعلیم و تلقین اور وعظ و نصیحت کا ایک ہمہ گیر نظام دعوت (۳) معاشرہ اور اس کے ادارے' خاندان سے لے کر وقف اور تکافل اجتماعی (رفاہ عامہ) تک اور (۴) ریاست' قانون اور نظام قضا (عدالتی نظام)۔

شریعت چاہتی ہے' یہ تمام کام انفرادی اور نجی سطح پر بھی انجام دیے جائیں اور اجتماعی طور پر بھی۔ چونکہ ریاست نظام امر کا مرکز ہے اور اللہ کے رسولؐ نے جو وظائف بحیثیت سربراہ انجام دیے ان کی امین ہے۔ اس لیے ریاست اور حکومت کی ذمہ داری دوہری ہے' یعنی خود اپنے دائرے میں اپنے فرائض کی انجام دہی اور دوسرے تمام اداروں کی معاونت و سرپرستی' تاکہ فرد اور سول ادارے اپنے اپنے کردار بخوبی انجام دے سکیں۔

اجتماعی دائرے میں نفاذ شریعت کے لیے جو حکمت عملی مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں اختیار کی ہے اس میں تنوع اور جدت ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وقت کے حالات اور مسائل کی روشنی میں انھوں نے کیا کیا راستے اختیار کیے۔ اصل نمونہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہے جو داعی اور مربی اور معلم بھی تھے اور سربراہ مملکت' قاضی اور حاکم بھی۔ آپؐ کی رہنمائی میں ایک مرکزی نظام کے ذریعے مندرجہ بالا چاروں دائروں کی رہنمائی کا حق ادا کیا گیا اور تاریخ کا روشن اور کامیاب ترین انقلاب رونما ہوا۔ خلافت راشدہ نے اسی نمونے پر عمل کیا اور نظام ریاست و قیادت میں شگاف پڑنے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اموی دور میں اس نمونے کے احیا کی کامیاب کوشش کی۔ بعد کے ادوار میں یہ مرکزیت اور ہمہ گیری باقی نہ رہی لیکن ہر ہر میدان کے لیے موثر انتظام کی کوشش کی گئی اور وقت کے چیلنجوں کی روشنی میں خصوصیت سے ریاست' قانون اور نظام عدالت کو اسلام کے مطابق اور شریعت کی حدود میں رکھنے کے لیے نئے تجربات اور نئے انتظامات کیے گئے۔ اس سلسلے کا سب سے عظیم اور تاریخی کارنامہ امت کے معتبر اور معتمد علما کا غیر سرکاری انتظام کے تحت فقہ اور اصول فقہ کی تدوین ہے۔ یہ قانون اخلاقی اور اجتماعی عوامی قوت و تائید سے ملک کا قانون بنانا اور ایک موثر اور آزاد نظام قضا (عدل) کا قیام عمل میں آیا جو شریعت کے نفاذ کا ضامن بن گیا اور خود ارباب اقتدار بھی اس قانون کے اسی طرح تابع ہو گئے جس طرح باقی انسان۔

اس طرح قانون کا وہ تصور جو دوسری تہذیبوں اور مملکتوں میں "حکمران کی مرضی" کے مترادف تھا بالکل بدل گیا۔ اسلامی قلمرو میں "شریعت" ہی ملک کا قانون بن گئی اور حکمران کی مرضی بھی اس کے تابع ہو گئی۔ یہ قانون کسی قانون ساز اسمبلی نے نہیں بنایا تھا' مگر اس کی تشکیل و ترقی میں سرکاری سرپرستی یا نظام سے وابستہ کسی ادارے نے نہیں بلکہ مسلمان امت اور اس کے آزاد فکری قائدین' علما' فقہا اور دوسرے

امور زندگی کے ماہرین نے حصہ لیا۔ ایک عوامی اور جمہوری طریقے اور عمل سے یہ قانون وجود میں آیا اور مسلسل ترقی کرتا رہا۔ اجتہاد، قیاس، استنباط، استحسان، مصالح مرسلہ، استدراک اور اجماع کے ذریعے یہ ایک تازہ پانی کی نہر کی طرح ترقی کرتا رہا اور ایک ہزار سال تک پوری اسلامی قلمرو کو سیراب کرتا رہا۔

ایسی مثالیں بھی ہیں کہ کچھ خدا ترس حکمرانوں نے اس قانون کو مرتب اور مدون کر کے اپنی قلمرو میں نافذ کرنے کی کوششیں کیں۔ ان میں برعظیم پاک و ہند میں فتاوی عالمگیری نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح دولت عثمانیہ میں مجلہ احکام عدلیہ کی تدوین ریاست اور علما و فقہا کی مشترک کوششوں کی مثال ہے۔ لیکن بنیادی چیز اسلامی قانون کا یہ مزاج ہے کہ وہ محض حکمران کی مرضی یا ترجیحات یا مقننہ (قانون ساز ادارے) کی آزاد مرضی کا نام نہیں، بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام، منشا و مرضی اور قرآن و سنت کے اصولوں کی روشنی میں پیش آمدہ معاملات کے بارے میں اصل ماخذ اور ان سے استفادے کے ضوابط کار کے مطابق رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش سے عبارت ہے۔

یہی وہ چیز ہے جسے دور غلامی سے نجات پانے اور آزاد مسلمان ریاست کے قیام کے بعد دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش میں ملت اسلامیہ پاکستان مصروف ہے۔ برطانوی اقتدار کے نقصانات اور مظالم کی فہرست تو بہت لمبی ہے لیکن بیرونی استعمار کا سب سے پہلا ہدف شریعت اور نظام قضا ہی تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سارے ہی ادارے تباہ کر دیے گئے اور آخری حصار یعنی خاندانی نظام پر بھی مختلف سمتوں سے تابڑ توڑ حملے کیے گئے اور اس عظیم الشان نظام کو تہ و بالا کر دیا گیا جو مسلمانوں نے اجتماعی میدان میں قائم کیا تھا۔

حصول آزادی کے بعد پہلا مرحلہ یہ تھا کہ ریاست کا قبلہ درست کیا جائے، اس کے مقاصد اور اہداف کو متعین کیا جائے اور نظام قانون کے اصول و ضوابط مرتب کیے جائیں۔ برطانوی دور میں تقریباً چار ہزار قوانین حکومت نے اپنے فرمان کے ذریعے مسلط کیے۔ ضرورت تھی کہ دستور کی صحیح بنیادوں پر تدوین کے بعد قانون کا جائزہ لیا جائے۔ ایمان اور آزادی کے تقاضوں کے مطابق پورے قانونی ورثے کا جائزہ لے کر نہ ان تقاضوں سے متصادم قوانین یا قوانین کے حصوں کو ختم کیا جائے بلکہ نئی قانون سازی ہو تاکہ مثبت انداز میں ان دونوں ضرورتوں کے مطابق نیا قانونی نظام اور عدالتی ڈھانچہ وجود میں آئے اور اس طرح وجود میں آئے کہ کوئی بحرانی کیفیت نہ پیدا ہو۔

قرارداد مقاصد اس سمت میں پہلا روشن اور تابناک قدم تھا۔ لیکن اس کے بعد سے آج تک ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے کی گردان کی جاتی رہی ہے۔ اور اس سے وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جن میں بار بار نفاذ شریعت کے مطالبے اٹھتے ہیں اور حکمران جان بچانے کے لیے چند نمایشی اقدام تو کرتے ہیں لیکن کوئی حقیقی پیش رفت نہیں ہوتی۔ مجھے ذاتی طور پر اس کا بہت قریب سے تجربہ صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں

ہوا۔ ہم نے پورے خلوص سے ان کو اسلامی نظام کے نفاذ کا ایک مربوط اور مکمل پروگرام دیا اور اپنی تمام سادگی اور اسلام کے لیے مخلصانہ جذبات کے اظہار کے باوجود وہ اس طرف کوئی حقیقی اور دیرپا پیش رفت نہ کر سکے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ نفاذ شریعت کے مسئلے کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ پھر مسئلے کی نوعیت کی مناسبت سے عملی اقدامات کا ایک ہمہ جہتی پروگرام مرتب کیا جائے اور اس کے نفاذ کے لیے موثر اور کارفرما مشینری وضع کی جائے۔

نفاذ شریعت کسی ایک اعلان کا نام نہیں۔ یہ تو ایک مسلسل عمل (process) ہے جس کی مختلف جہتیں ہیں اور ہر جہت کو دوسری کا معاون و مددگار اور اس کی تقویت کا باعث ہونا چاہیے۔ تب ہی مربوط اور دیرپا نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ ضیاء صاحب بار بار کہتے تھے کہ آپ مجھے کوئی ایک چیز بتا دیں جس کے اعلان سے شریعت نافذ ہو جائے اور میں ہمیشہ ان کو یہی سمجھاتا تھا کہ اگر آپ فی الحقیقت نفاذ شریعت چاہتے ہیں تو اس کے لیے ایک اعلان نہیں، تبدیلی کا ایک مفصل اور مربوط پروگرام بنانا ہو گا۔۔۔ اس کے اہم اجزا یہ ہیں:

۱۔ دستور میں قرآن و سنت (شریعت) کی بالادستی کا اظہار اور اسے قانون سازی اور پالیسی سازی کے لیے مستقل ماخذ قرار دینا۔ نیز دستور میں ایسی ترامیم جو اس کو شریعت سے متصادم اجزا سے پاک کر دے۔ دستور کو بار بار کھولنا یا مستقلاً عدلیہ کے رحم و کرم پر چھوڑنا صحیح نہیں۔ اسی لیے دستور سازی اور قانون سازی میں فرق کیا جاتا ہے اور اس کا احترام ہونا چاہیے۔ خاص طور پر جب ہم نے تحریری دستور کا راستہ اختیار کیا ہے تو اس کے تقاضے بھی پورے کرنے چاہییں۔

۲۔ دستور میں شریعت کے قانونی احکام کے نفاذ کے لیے ایک واضح اور موثر نظام کار کا تعین۔

---- دفعہ ۲۲۷ ایک اہم انتظام ہے لیکن اس کا تقاضا ہے کہ پارلیمنٹ ایک متعین مدت میں اپنا فرض انجام دے۔ ۱۹۷۳ کے دستور میں اس کے لیے ۷ سال کی مدت رکھی گئی تھی کہ اس زمانے میں تمام مروجہ قوانین کو شریعت سے ہم آہنگ کر لیا جائے گا۔ یہ کام آج تک نہیں ہوا ہے۔

---- اسی دفعہ کی رو سے آیندہ کے لیے بھی شریعت کے احکام کے نفاذ کے لیے قانون سازی ضروری ہے اور یہ قانون سازی، اسمبلی اور سینٹ کو اسلامی نظریاتی کونسل کے مشورے اور معاونت سے کرنا تھی۔ اس باب میں بھی ہمارا ریکارڈ بڑا ہی افسوس ناک ہے۔ برطانوی دور کے چار ہزار سے زیادہ قوانین کے مقابلے میں گذشتہ پچاس سال میں بمشکل چار سو قوانین منظور ہوئے ہیں جن کی بہت بڑی اکثریت صرف پرانے قوانین میں جزوی ترامیم پر مشتمل ہے۔ تعداد کے اعتبار سے بھی ان پچاس برسوں میں کی جانے والی قانون سازی انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ معیار کی بات تو رہنے دیجیے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے ۱۹۶۲ سے اب تک تقریباً پچاس رپورٹیں تیار کی ہیں لیکن ان کی بنیاد پر کوئی قانون سازی نہیں ہوئی۔

۳- دستور نے شریعت کے نفاذ کے سلسلے میں دفعہ ۲۲۷ کے ساتھ ایک دوسرا راستہ "پالیسی کے راہنما اصول" (باب ۲' دفعہ ۲۹ تا ۴۰) کی شکل میں نکالا۔ جو عدالتوں کے ذریعے تو نافذ العمل نہیں تھا مگر ہر سال پارلیمنٹ کو کارکردگی کی رپورٹ کی شکل میں اس عمل کو آگے بڑھانا پیش نظر تھا۔ اس سلسلے میں بھی پیش رفت صفر ہی رہی۔

ان تینوں کے عملاً غیر موثر ہو جانے کے بعد نفاذ شریعت کا ایک دوسرا نسبتاً مختصر راستہ عدلیہ کو یہ اختیار دینا تھا کہ خود اپنے ایما یا اختیار (suo muto) یا کسی کے توجہ دلانے اور استغاثہ کرنے پر کسی قانون کا جائزہ لے کر متعین کر سکے کہ وہ قانون قرآن و سنت کے مطابق ہے یا متصادم' اور تصادم اور عدم تطابق کی صورت میں اسے کس طرح کالعدم کیا جائے۔

یہاں مسئلہ یہ پیش آیا کہ عدالتوں کے جج حضرات بالعموم اس علم و تقویٰ سے آراستہ نہیں جو اس کام کو انجام دینے کے لیے درکار ہے۔ صحیح راستہ تو یہ تھا کہ قانون کی تعلیم کے نظام کو' وکلا اور ججوں کی تربیت' انتخاب' ترقی کے اصول و ضوابط کو تبدیل کیا جائے۔ ایک ایسا انتظام کیا جائے کہ ایک معقول مدت میں نیچے سے اوپر تک جج قانون کے علم کے ساتھ شریعت کا علم بھی رکھتے ہوں اور اخلاق و تقویٰ کے اعتبار سے بھی دینی معاملات میں قوم کے اعتماد کے مستحق ہو سکیں۔ یہ عمل صحیح اور معیاری ہونے کے باوجود وقت طلب تھا۔ اس لیے صدر ضیاء کے دور میں پہلے تمام ہائی کورٹوں میں شریعت بنچ کے قیام کی تجویز آئی جسے عدلیہ نے پسند نہیں کیا۔ پھر فیڈرل شریعت کورٹ کا راستہ اختیار کیا گیا جس پر ۱۹۸۰ سے عمل ہو رہا ہے اور جس کے لیے دستور میں ایک پورے باب کا اضافہ کیا گیا۔ اس میں چند بڑی بڑی خامیاں رہ گئیں:

۱- اس کا دائرہ کار محدود تھا۔ قوانین کی اکثریت اس کے دائرہ کار سے باہر تھی۔

۲- یہ صرف قانون یا اس کے کسی حصہ پر کلام کر سکتی تھی۔ انتظامی احکام (executive action) اس کے دائرے سے باہر تھے۔

۳- اس کے ججوں کا تقرر' تبدیلی' تنزلی وغیرہ کے بارے میں ایسے من مانے ضابطے بنائے گئے جو نہ صرف عدلیہ کی آزادی اور اس عدالت کے مستقل وجود کے منافی تھے بلکہ خود اسلام کے تصور عدل کے ساتھ بھی مذاق تھے۔

۴- اسے داد رسی اور عارضی احکام (interim injunction) کا اختیار حاصل نہ تھا۔ یعنی یہ عدالت بالکل بے طاقت تھی۔

۵- اس کو صرف حدود کے معاملات میں اپیلوں کی سماعت کا اختیار حاصل تھا۔ باقی اس کا اصل دائرہ اختیار صرف قوانین کے بارے میں رائے دینے تک محدود تھا۔ غنیمت ہے کہ اتنی گنجایش تھی کہ اگر اس کے دیے ہوئے وقت میں مقننہ قانون سازی نہ کرے یا سپریم کورٹ میں اپیل نہ ہو جائے تو کم از کم زیر نظر قانون کا خلاف شریعت حصہ معدوم ہو جائے گا۔ گو اس کی نوبت کم ہی آ سکی۔

اس طرح نفاذ شریعت (قانون کے جدید تصور کی حد تک) کے جو دو راستے ہو سکتے ہیں، عملاً دونوں ہی غیر موثر رہے ہیں۔ اور اس وقت سب سے اہم فیصلہ یہی کرنا ہے کہ ان میں سے کون سا راستہ اختیار کیا جائے، یا دونوں طریقوں کو بہ یک وقت جاری رکھا جائے (راقم کی بھی یہی رائے ہے) لیکن اس عمل کو موثر بنانے کے لیے جن تبدیلیوں کی ضرورت ہے، دستور میں وہ ترامیم کی جائیں۔ نیز عملاً اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے جن دوسرے امور کی ضرورت ہے ان کی فکر کی جائے۔

نفاذ شریعت کا عمل محض قانونی عمل نہیں ہے، گو قانونی دائرے میں قانونی مشینری کے ذریعے اس کام کو انجام دینا ازبس ضروری بھی ہے اور اس کے لیے مزید موثر اقدامات بھی درکار ہیں۔ اس قانونی عمل کے ساتھ جن دوسرے اقدامات کی ضرورت ہے ہم پہلے ان کی نشاندہی کرتے ہیں اور پھر موجودہ پندرھویں دستوری ترمیم پر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔

(ا) پہلی اہم ترین چیز قانون کے ساتھ ساتھ پالیسی، پالیسی سازی کے طریق کار، پالیسیوں پر احتساب اور انتظامی احکامات کو بھی عدالتی مواخذے (judicial review) کے لیے کھولنا ہے۔ شریعت کے نفاذ کے لیے صرف قانون سازی ہی کافی نہیں، بہت بڑا دائرہ پالیسی سازی کا ہے اور اس طرف کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ اس کے لیے کوئی مشینری بھی موجود نہیں ہے۔ ہر وزارت آزاد ہے اور شرعی رہنمائی اور احتساب کا کوئی نظام نہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل محض ایک غیر موثر مشاورتی ادارہ ہے اور اس سے بڑھ کر اس کا کوئی تعلق حکومتی مشینری سے نہیں۔ یہ ایک دور دراز جزیرے کے طور پر کام کرتا ہے جبکہ ملک کے پلاننگ کمیشن اور تمام مشاورتی اداروں سے اس کا دستوری، انتظامی اور عملی تعلق (interaction) ہونا چاہیے۔ راقم کو اس کا عملی تجربہ اس وقت ہوا جب پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین اور وزیر منصوبہ بندی کی حیثیت سے نفاذ اسلام کی طرف پیش قدمی اور منصوبہ سازی کی کوشش کی گئی۔ معلوم ہوا کہ مشاورتی کونسل کا کوئی ربط کسی پالیسی ساز ادارے سے نہیں اور نہ پالیسی ساز اداروں نے یہ زحمت کی کہ اس ادارے سے کوئی استفادہ کریں۔ ہم نے پلاننگ کمیشن اور نظریاتی کونسل کے مشترک اجتماعات کیے اور ان کی مشترک کمیٹیاں تشکیل دیں تو معلوم ہوا کہ پالیسی سازی میں اسلام سے رہنمائی لینے کا عمل کس طرح متحرک کیا جا سکتا ہے۔

یہ بڑا قیمتی لیکن مختصر تجربہ تھا' پاکستان قومی اتحاد کے حکومت سے نکلنے کے بعد (۱۹۷۹) سارا انتظام بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ اس سے دو سبق حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب تک تمام پالیسی ساز اداروں اور افراد کو عملاً اس کام میں شریک نہ کیا جائے کوئی پیش رفت مشکل ہے۔ دوسرے' یہ کام محض وقتی طور پر نہیں' مستقل بلکہ اداراتی انتظام کی شکل میں ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے لیے سب سے اہم چیز سیاسی اثر و رسوخ' عزم و ارادہ اور جذبہ عمل (political will) ہے۔ پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالنے سے یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نفاذ اسلام کے عمل کو غیر موثر اور غیر نتیجہ خیز کرنے والی چیز اسی سیاسی ارادے کی کمی ہے اور یہ صرف ایک فرد کے عزم کا مسئلہ نہیں' یہ پوری سیاسی مشینری اور اجتماعی قیادت کے ارادے اور عزم کا مسئلہ ہے اور جب تک یہ حل نہ ہو گا' گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔

(۲) دوسری اہم ترین ضرورت سیاسی عزم و ارادہ ہے جس کا اظہار ہر سطح پر ہونا چاہیے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انقلاب قیادت واقع ہو۔ اب تک کی تمام ہی قیادتوں کا حال (چند انفرادی استثنائی حوالوں کو چھوڑ کر) بڑا ہی مایوس کن رہا ہے۔ قانون سازی اور پالیسی کی تبدیلی کا آخری انحصار افراد کار کی تبدیلی اور انقلاب قیادت پر ہو گا۔ سیاسی قیادت کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبے کی قیادت میں اندر سے تبدیلی آئے یا اسے ایسے افراد سے تبدیل کیا جائے جو اس میدان میں صحیح قیادت اور نمونہ فراہم کر سکیں۔ اس قیادت کے لیے تین چیزیں ازبس ضروری ہیں: اول' اس کا اپنا عزم' وژن' کردار اور نمونہ۔ دوم' اس کا علم' تجربہ' صلاحیت کار' مشاورتی نظام اور اعلیٰ کارکردگی۔ سوم' ایک موثر نظام شوریٰ اور احتساب تاکہ قیادت صحیح راستے پر قائم رہ سکے اور اسے اس راستہ پر گامزن رکھا جاسکے۔

اس سلسلے میں اہم ترین مثال سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی ہے کہ کس طرح ایک ایسے نظام میں جس میں بگاڑ واقع ہو گیا تھا اور قدیم جاہلیت نے اسلام کی انقلابی اصلاحات کو غیر موثر یا معدوم کر کے پیچھے کی طرف چلانا شروع کر دیا تھا' انھوں نے ڈھائی سال کے مختصر وقت میں دوبارہ نظام حکومت و ریاست کو خلافت راشدہ کی راہ پر ڈالا۔ اور بے نفسی' قربانی' مفاد پرست طبقات پر ضرب اور ریاست کو اس کے اسلامی مقاصد کے لیے دوبارہ منظم کرنے کا کام انجام دیا۔ اپنی ذات سے اصلاح کا آغاز کر کے' اپنے خاندان اور قبیلہ کو لگام دی۔ حق پرستی' اصولوں پر عدم لچک' مظلوموں کی داد رسی' میرٹ کا اہتمام اور نتائج سے بے پروا ہو کر باطل سے سمجھوتوں کی روش سے اجتناب کیا۔ یہ تھا قیادت کا وہ نمونہ جو عمر ثانی نے پیش کیا اور یہی وہ نمونہ ہے جس کی آج ضرورت ہے۔

(۳) دستور' قانون' پالیسی اور قیادت کے بعد تعلیم و تربیت' مطلوبہ مردان کار کی تیاری اور ترغیب و ترہیب کے ایسے نظام کا قیام ضروری ہے جس کے نتیجے میں صحیح افراد ہر سطح پر ذمہ داری کے مقام پر آ

سکیں۔ لوگوں کو اعتماد حاصل ہو اور وہ نظام پر بھروسہ کرنے لگیں۔ جہاں ضروری ہے کہ پہلے قدم پر ہی اس کام کا آغاز کر دیا جائے وہاں یہ بھی ضروری ہو گا۔ اسے مستقل مزاجی سے جاری رکھنے کا اہتمام ہو تاکہ فطری انداز میں مناسب نظام الاوقات کے تحت تبدیلی واقع ہو سکے۔

(۴) اس پورے عمل میں جہاں قانون کی بڑی اہمیت ہے، وہاں افراد اور معاشرے کی ایسی تیاری ضروری ہے کہ لوگ دلی آمادگی اور خوش دلی سے شریعت کے نفاذ کے عمل میں شریک ہوں۔ یہ کام نہ محض وعظ سے ہو سکتا ہے اور نہ صرف جبر اور ڈنڈے کی قوت سے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ نفاذ شریعت کا ہمیں سکھایا ہے اور جس کا نمونہ آپؐ نے پیش فرمایا، اس کا نمایاں خاصہ، دل اور ذہن کی تبدیلی اور اخلاق و کردار کے انقلاب کے ساتھ، قانون اور حکومت کی انتظامی اور تادیبی قوتوں کا متوازن اور حسین امتزاج ہے۔ نفاذ شریعت کے لیے ہر دور میں ان دونوں دھاروں کا آپس میں ملنا اور ایک دوسرے کو تقویت پہنچانا ضروری ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر عمل ہے اور اس میں سب کی شرکت ضروری ہے۔ یہ مقصد پابندیاں لگانے اور ڈر اور خوف کی فضا پیدا کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے آزادی، اختلاف اور رواداری کا ہونا ضروری ہے، ورنہ آمریت اور استبداد کی فضا میں یہ عمل جاری نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے تو حقوق کا احترام، فرائض کی ادائگی کا جذبہ، شوریٰ کی فضا، نیکیوں میں مسابقت کا شوق، ایک دوسرے کے لیے احترام، ایثار، قربانی اور باہم معاونت درکار ہے تاکہ گرتوں کو تھاما جا سکے اور بے راہ روی کا شکار ہو جانے والوں کو سینے سے لگا کر جہنم کی آگ اور دنیا کے خسران سے بچایا جا سکے۔ معاشرے میں یہ فضا اور یہ جذبہ پیدا کرنا بھی نفاذ شریعت کا لازمی حصہ ہے۔

(۵) یہ پورا کام جس ذہن اور جذبے سے ہونا چاہیے وہ وہی ہے جس کا نمونہ حضور اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا، یعنی دنیا میں انسانوں کے درمیان انصاف اور حقوق العباد کی ادائگی، اور اصل منزل آخرت کی کامیابی اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی کا حصول۔ شریعت کے احکام و ضوابط کو مقاصد شریعت کو نظرانداز کر کے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ مقاصد بہت واضح ہیں یعنی ● دین و ایمان کا تحفظ ● جسم و جان کی حفاظت ● اخلاق، عصمت، خاندان اور نسل انسانی کا تحفظ ● عقل و شعور کی حفاظت اور ● مال کا تحفظ۔ انھی کے قیام سے معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے۔ یہ بڑی معنی خیز حقیقت ہے کہ اسلام کے تعزیری قانون میں جن حدوں کے تحفظ کو قرآن و سنت نے سزاؤں کے تعین کے ساتھ طے کر دیا وہ یہی پانچ مقاصد ہیں۔ دنیا کے دوسرے تعزیری قوانین میں سیکڑوں نہیں ہزاروں جرائم اور ان کی سزائیں ہیں، لیکن اسلام نے جن جرائم اور ان کی سزاؤں کو حدود کا مقام دیا وہ یہی پانچ چیزیں ہیں۔ دین و ایمان کی حفاظت کے لیے ارتداد کی سزا کی حد، جسم و جان کے تحفظ کے لیے قصاص و دیت کا قانون، اخلاق، خاندان، عزت، و

عصمت اور نسل کے تحفظ کے لیے زنا اور قذف کی حدود، عقل کے تحفظ کے لیے تحریم خمر اور شراب کی حد اور مال کے تحفظ کے لیے سرقہ اور حرابہ کی حدود--- یہ حدود محض سزائیں نہیں، یہ تو شریعت کے اصل مقاصد اور انسانی معاشرے کی اصل بنیادوں کے تحفظ کا نظام ہیں۔ مقصد سزا دینا نہیں، مقصد ان بنیادوں کا تحفظ، ان کی مضبوطی اور انسانی زندگی کو عدل و انصاف اور عزت و خوش حالی کی برکتوں سے مالا مال کرنا ہے۔

نفاذ شریعت کے یہ تمام پہلو وہ ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور مل کر ایک نامیاتی کل (organic whole) بناتے ہیں۔ نفاذ شریعت کے پروگرام کو ان سب کا احاطہ کرنا چاہیے ورنہ وہ ناکمل اور غیر موثر رہے گا۔

مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں اگر حکومت کے تجویز کردہ پندرھویں ترمیمی بل کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں اس میں کچھ بہت ہی بنیادی خامیاں، کمزوریاں اور جھول نظر آتے ہیں۔ البتہ ان پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم اس امر کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن و سنت کو دستور کی دفعہ ۲ میں ملک کا بالاترین قانون بنانے کا اعلان صحیح سمت میں ایک قدم ہے اور ہم اسے خوش آمدید کہتے ہیں۔

بلاشبہ دستور میں قرارداد مقاصد کا پہلے دستور کا دیباچہ ہونے کی حیثیت سے اور ۱۹۸۵ میں ترمیم کے ذریعے دفعہ ۲-الف کی شکل میں ایک موثر (substantive) حصہ بن جانے اور دفعہ ۲۲۷ میں قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی پر پابندی کے باوجود یہ سقم تھا کہ شریعت کی حقیقی اور مکمل بالادستی تسلیم نہیں کی گئی تھی۔ یہ بات خاص طور پر دستوری امور پر پچھلے چالیس برس میں کیے جانے والے اہم عدالتی فیصلوں کی روشنی میں اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ جب ۱۹۵۶ اور ۱۹۶۲ کے دساتیر کو مارشل لا کی ضرب سے توڑ دیا گیا تو لاہور ہائی کورٹ نے اور پھر فیڈرل کورٹ نے دو فیصلوں میں یہ جرات مندانہ اعلان کیا کہ قرارداد مقاصد ناقابل تنسیخ ہے۔ یہ پہلی دستور ساز اسمبلی کا طے کردہ بنیادی وثیقہ (دستور اساسی) ہے جسے grandnorm کی حیثیت حاصل ہے۔ عاصمہ جہانگیر کیس میں یہ چیز خاص طور پر سامنے آئی لیکن جلد ہی سپریم کورٹ میں جسٹس حمود الرحمٰن جج نے ایک اہم فیصلے میں یہ پوزیشن اختیار کی گو قرارداد مقاصد سب سے اہم دستوری دستاویز اور اعلانیہ ہے مگر چونکہ یہ دستور کا موثر حصہ نہیں اس لیے اسے بالادستی حاصل نہیں۔ اس سقم کو دور کرنے کے لیے جنرل ضیاء الحق نے اسلامی نظریاتی کونسل کے مشورے پر دستور کی دفعہ ۲-الف کی شکل میں قرارداد مقاصد کو دستور کا قابل تنفیذ حصہ بنا دیا۔ اس کے بعد چند بڑے اہم فیصلے کراچی اور لاہور کی عدالت ہائے عالیہ میں ہوئے جن میں قرارداد مقاصد کو باقی دستور پر حاوی قرار دیا گیا اور اس کی روشنی میں عائلی قانون کے تحفظ (protection) اور چند دوسرے امور کا جائزہ قرارداد مقاصد کی روشنی میں لیا گیا۔

لیکن پھر سپریم کورٹ نے جسٹس نسیم حسن شاہ کے بنچ میں ۱۹۹۳ کے دوران حاکم خاں کیس میں اس رجحان کے آگے بریک لگا دیا اور یہ طے کیا کہ ۲- الف بھی دستور کی ایک دفعہ ہے جس کی میزان پر باقی دفعات کو پرکھا نہیں جا سکتا۔ یہ وہ فیصلہ ہے جس کے بعد دستوری طور پر ضروری ہو گیا کہ قرآن و سنت کی بالادستی کی حیثیت کو صاف لفظوں میں شامل دستور کیا جائے اور اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ قرآن و سنت' دستور کے دوسرے اندراجات' قانون' عدالتی فیصلوں' غرض ہر چیز پر فائق اور بالاتر ہوں گے۔ ملکی قانون کی اصل شریعت ہے اور باقی ہر چیز اس کے تابع۔ اس ترمیم کے بغیر سپریم کورٹ کا مندرجہ بالا فیصلہ موثر رہتا ہے اور قرآن و سنت اور قرارداد مقاصد اصل بالاتر قانون قرار نہیں پاتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ ترمیم ہو۔ محض اسلام کے سرکاری مذہب ہونے کا اعلان اور دفعہ ۲۲۷ اس کمی کو دور کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس حد تک ترمیم ازبس ضروری ہے اور اس کو جلد از جلد دستور کا حصہ بنانا چاہیے۔

اس مثبت پہلو کی تائید کے ساتھ ساتھ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ترمیم اپنی موجودہ شکل میں ناقص اور منظوری سے پہلے اصلاح طلب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی روایات کو قائم رکھتے ہوئے حکومت نے بغیر مشورہ اور بغیر مناسب تیاری' بس جوش میں یا کچھ وقتی مصالح اور عاجلانہ فوائد کی امید پر یہ مسودہ اسمبلی میں پیش کر دیا اور وزیراعظم صاحب نے تقریر فرما دی کہ نفاذ شریعت کا وعدہ بھی پورا ہو گیا۔ یہ تمام باتیں بہت سطحی ہیں۔ اس ترمیم کی ضرورت مسلم ہے لیکن اس کو انسانی حد تک غلطیوں اور تسامحات سے پاک ہونا چاہیے۔ دستور کی ترمیم کا معاملہ ویسے بھی بہت نازک اور ذمہ داری کی چیز ہے لیکن جب معاملہ شریعت کے نفاذ کا ہو تو یہ اور بھی زیادہ نازک کام ہو جاتا ہے۔ اس سہل انگاری سے اسے انجام دینا نہ صرف بڑی غیرذمہ داری کی بات ہے بلکہ ملک و ملت کے لیے بڑا خطرناک اور پریشان کن ہو سکتا ہے۔

ہم تمام اعتراضات کو الگ بیان کرنے کے بجائے یہاں پر صرف اپنی تجاویز پر اکتفا کر رہے ہیں جن پر غور کرنے سے ہمارے اعتراضات بھی آپ سے آپ سامنے آ جائیں گے:

۱- اس نوعیت کی ترامیم کو جلد بازی سے ایوان میں نہیں لانا چاہیے۔ بل پیش کرنے سے پہلے اسے وسیع مشاورت کے نظام سے گزرنا چاہیے۔ یہ موضوع تو ایسا تھا کہ اس سے نفاذ شریعت کے پورے مسئلے پر سیر حاصل بحث ہوتی اور پھر دستوری ترمیم' قانون کی تبدیلی کا طریقہ اور اس کے لیے اقدامات' پالیسیوں کی تشکیل نو کا نظام' احتساب کی شکل' تعلیم اور معاشرے کی تیاری کا پروگرام اور اس کے لیے دوسرے قوانین کے مسودے' یہ تمام چیزیں ایک قرطاس ابیض (white paper) کی شکل میں قوم کے سامنے پیش کی جاتیں۔ اسی میں دستوری ترمیم کا مجوزہ مسودہ بھی ہوتا تاکہ اس پر کھل کر بحث ہو سکے اور تجاویز دی جا سکیں۔ پھر اس بحث اور تجاویز کی روشنی میں حکومت دستوری بل کا مسودہ تیار کر کے ایوان میں پیش کرتی۔ اب بھی یہ

راستہ اختیار کیا جائے تو اس میں خیر ہے۔

۲- دستوری ترمیم کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اپنی موجودہ شکل میں اس میں پانچ امور کا احاطہ کیا گیا ہے اور ایک ہی تیر سے ان سب کا معاملہ طے کر دیا گیا ہے۔ یعنی: ۱- قرآن و سنت کی بالادستی، ۲- مرکزی حکومت کا اختیار۔ دستور، قانون اور عدالتی فیصلوں سے بے نیاز ہو کر، ۳- شخصی قانون کے معاملے میں ہر فقہ کی رائے کا احترام، ۴- اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ اور ۵- دستور میں ترمیم کے طریقے کو شریعت کے نفاذ میں مانع مشکلات کو دور کرنے کے لیے قانون کی سطح پر لے آنا--- ان سب کا اس طرح جمع کر دینا قرین حق و انصاف نہیں۔ ہر مسئلہ کو الگ الگ لیا جائے، جو ضروری ہو، اس کو معقول شکل میں شامل کیا جائے اور جو غیر ضروری ہو یا جس میں فتنہ کا احتمال ہو اس کو ترک کر دیا جائے۔ اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ اس ترمیم کی شق-۱ میں قرآن و سنت کو بالاترین قانون بنایا جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ لکھ دیا جائے کہ "یہ شق دستور کے باقی تمام مندرجات، ہر قانون اور عدالتوں کے ہر فیصلے پر حاوی ہو گی"۔ اس طرح شریعت کی بالادستی دستور و قانون کی حد تک غیر مشتبہ اور حتمی ہو جائے گی۔ یہ سب سے بنیادی ترمیم ہے اور اسے بھی اس ترمیم کا مرکزی حصہ ہونا چاہیے۔

۳- ہماری نگاہ میں مرکزی حکومت کے لیے کسی خصوصی اختیار کی ضرورت نہیں۔ وہ اسے اپنے دائرے میں داخل ہر معاملے میں حاصل ہے اور انھی آداب و ضوابط کے مطابق نفاذ شریعت کی ذمہ داری اسے ادا کرنی چاہیے۔ اسے دستور، قانون اور عدالت تینوں کے سامنے جواب دہ رہنا چاہیے، ورنہ خطرہ ہے کہ ملک شریعت کے نام پر آمریت کے راستے پر چل پڑے گا اور اس کے قرائن اور رجحانات بھی موجود ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ شق ۵ کے استثنائی اختیارات صرف شق ۱ میں قرآن و سنت کی بالادستی کے اصل معاملے کو حاصل ہوں، حکومت کے احکامات کو نہیں۔ اگر اس شق کو رکھنا حکومت ضروری سمجھتی ہے تو پھر اس میں مناسب ترمیم کے ذریعے مرکزی حکومت کے ساتھ صوبائی اور لوکل حکومتوں کا اضافہ ہو اور دستور کے وفاقی نظام کے طے کردہ اختیاراتی فریم ورک میں ہر ایک اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرے۔ نیز مرکزی یا صوبائی حکومت اس سلسلے میں کوئی متبادل یا معاون مشینری بنائے تو وہ باقاعدہ قانون کے ذریعے ہو تاکہ من مانی کارروائیوں کا دروازہ نہ کھلے۔ یہ پورا عمل شفاف بھی ہونا چاہیے اور اسے احتساب سے بالا بھی نہیں ہونا چاہیے۔

۴- مجوزہ ترمیم کا سب سے قابل اعتراض پہلو دستور میں ترمیم کے طریقے کو تبدیل کرنا ہے جو اپنے اندر بے پناہ خطرات رکھتا ہے۔ غضب ہے کہ دستور میں ترمیم کو جو دنیا کے سارے دساتیر میں سب سے مشکل ہوتا ہے، عام قانون سازی کی اس سطح پر لے آیا گیا ہے جہاں دونوں ایوانوں کی کل تعداد کی دو تہائی اکثریت (جو اس وقت درکار ہے) ہی ختم نہ ہو گی بلکہ دونوں ایوانوں کی تعداد کی عام اکثریت (یعنی ۵۰ فی صد)

بھی مطلوب نہیں۔ اس ترمیم کی رو سے ایوان میں جتنے افراد بھی موجود ہوں بس ان کی اکثریت کافی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کورم کی حد تک بھی اگر ارکان موجود ہیں تو صرف ان کی سادہ اکثریت سے دستور تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں علم ہے "مشکلات" دور کرنے کے الفاظ کو کہاں تک وسعت دی جا سکتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق صاحب نے سپریم کورٹ کی ایک ایسی ہی اجازت سے کام لے کر پہلا پروویژنل دستور نافذ کیا اور پھر دستور کی بحالی کے موقع پر ۱۰۴ ترامیم کر ڈالیں۔ یہ اختیار ہرگز ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ دستور پر نظرثانی کی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مناسب راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے جسے ہم بعد میں تجویز کر رہے ہیں۔

۵- جہاں تک شق ۳ اور ۴ کا تعلق ہے یہ غیر ضروری ہیں۔ دستور میں دونوں امور (شخصی قانون میں ہر مکتب فکر کی فقہ کا احترام اور اقلیتوں کی مذہبی، تعلیمی اور ثقافتی آزادی) واضح طور پر مرقوم ہیں اور ہر جگہ ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک قسم کے احساس کمتری کی غمازی کرتا ہے جس کا دستور میں اس طرح اظہار مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ اگر خاص پریشر گروپوں کو اس سے مطمئن کیا جا سکے تو ہمیں کوئی اصولی اعتراض نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اقلیتی گروہ اور خصوصیت سے عیسائی اقلیت جو آبادی کا ایک فی صد ہے، اپنے حقوق پر نہیں، مسلمانوں کے اس حق پر معترض ہے کہ وہ اپنے ملک میں شریعت کیوں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ کم سے کم الفاظ میں یہ اسی سامراجی ذہنیت کا مظہر ہے جو برطانوی اور دوسرے مغربی استعماری غلبے کے دور میں عیسائی اقلیتوں نے ان سامراجی طاقتوں کے ایما پر اور ان کے مفاد میں اختیار کیا تھا اور آج بھی مغربی اقوام ہی ان کو اس پر اکسا رہی ہیں۔ فرانس میں مسلمان عورت کو اسکارف پہننے کی اجازت نہیں اور یہاں یہ اقلیتی گروہ مسلمانوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اپنے دین پر نہ چلو۔ اس ذہنیت کا علاج معذرتیں کرنا اور مراعات دینا نہیں بلکہ قرآنی اعلان، لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ہے۔

۶- اس دستوری ترمیم کا سب سے بڑا سقم یہ ہے کہ اس میں اس اصل مسئلے کا کوئی حل نہیں نکالا گیا جس کی وجہ سے قرارداد مقاصد کے حصہ دستور بننے کے بعد بھی قرآن و سنت کی بالادستی کے واضح اعلان کی ضرورت تھی۔ دراصل سپریم کورٹ نے دستور کی تعبیر کے سلسلے میں ایک بڑا ہی بنیادی فیصلہ کر دیا ہے اور وہ یہ کہ دستور کی ہر دفعہ اپنی جگہ مستقل بالذات ہے اور دوسری دفعات پر حاوی نہیں الا یہ کہ اس کی وضاحت کر دی گئی ہو جیسے ۵۸-۲(ب) یا ۲۰۳- الف میں کی گئی ہے۔ نیز دستور کی کچھ دفعات خود تنفیذی (self executing) ہیں جیسے دفعہ ۸ اور کچھ خود تنفیذی نہیں جیسے ۲-الف۔ ترمیم کی اصل ضرورت ہی اس لیے ہے کہ ان کمزوریوں کو دور کر دیا جائے اور ہماری مجوزہ شکل میں یعنی شق ۱ میں not withstanding any provision in the constitution, law or decision of any court of law کے اضافے کے بعد یہ دفعہ پورے دستور اور قانونی نظام پر حاوی ہو جائے گی۔ اور یہی مقام قرآن و سنت کا ہونا

چاہیے۔ البتہ اس میں جو مشکل ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر اپنے اپنے انداز میں مولانا محمد تقی عثمانی جج سپریم کورٹ شریعت بنچ اور ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن سابق چیف جسٹس فیڈرل شریعت کورٹ نے کیا ہے۔ یعنی یہ کون طے کرے گا کہ تصادم کہاں ہے اور وہ کس طرح دور ہو۔ اس کے لیے کئی راستے اختیار کیے جاسکتے ہیں لیکن اس مسئلے سے تعارض کیے بغیر گزر جانے کے معنی یہ ہیں کہ عدالتی مجادلوں کا ایک باب کھل جائے اور قوم مزید الجھاؤ کا شکار ہو' شریعت عدل تو فراہم نہ کر سکے مگر قانونی انارکی پیدا ہونے کا خطرہ وجود میں آجائے۔ یہ شریعت کے ساتھ کوئی اچھا معاملہ نہیں ہو گا۔

(الف) اس امر کی ضرورت ہے کہ دستور میں پائے جانے والے سقم اور تضادات اور قوانین میں پائے جانے والے تصادم اور تناقضات کو الگ الگ لیا جائے۔ دستور کو مستقلاً مرکزی حکومت یا خود عدالتوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ یہ سب دستور ہی کی پیداوار ہیں اور اپنے اختیارات دستور ہی سے اخذ کرتے ہیں۔ اس لیے دستور میں ترمیم کے لیے ایک دستوری کمیشن بنایا جائے جو ماہرین دستور' بالغ نظر اور معتمد علیہ سیاست دانوں اور علما پر مشتمل ہو۔ اسلامی نظریاتی کونسل سے بھی رجوع کیا جائے اور یہ کمیشن ۶ ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کے اندر ان تمام تناقضات کی نشاندہی کر دے جو شریعت کی بالادستی کے نقطہ نظر سے دستور کی مختلف دفعات میں ہیں اور پارلیمنٹ دستور میں مناسب ترمیم کے ذریعے ان تناقضات کو دور کر دے۔ یہ کام ایک بار ہو جانا چاہیے اور یہ دروازہ ہرگز کھلا نہیں رہنا چاہیے کہ حکومت یا کوئی گروہ ہر روز ایک نیا مسئلہ اٹھا دے۔

(ب) عام قوانین کے لیے دو راستے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ یا دستور کی دفعہ ۸ کی طرح دفعہ ۲ میں بھی یہ بات شامل کر دی جائے کہ جس طرح بنیادی حقوق سے متصادم قوانین دستور کے تحت ختم ہو جائیں گے' اسی طرح قرآن و سنت کے منافی موجود الوقت قوانین ایک خاص مدت کے اندر ختم (void) تصور کیے جائیں گے' مثلاً ایک سال۔ بہت سا کام اسلامی نظریاتی کونسل اور لا کمیشن کر چکے ہیں۔ پارلیمنٹ ان سب پر غور کرے اور ایک سال میں مروجہ قوانین کی اصلاح کرے ورنہ وہ آپ سے آپ ختم ہو جائیں۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ ججوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ اس کے دائرہ کار کو وسیع کیا جائے اور دستور کے علاوہ تمام قوانین کے احتساب اور جائزے کا اختیار اس کو دے دیا جائے تاکہ معمول کے عمل سے فیڈرل شریعت کورٹ کے ذریعہ تمام قوانین شریعت سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ ملک کی جس عدالت میں بھی کسی قانون کے خلاف شریعت ہونے کا سوال اٹھے' اسے فیڈرل شریعت کورٹ کو سماعت کے لیے بھیج دیا جائے۔ اگر یہ اختیار ہر عدالت کو دیتے ہیں تو اس میں کنفیوژن پیدا ہونے کا زیادہ خطرہ ہے اور علم و اہلیت کے اعتبار سے بھی ہر عدالت پر اس باب میں بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ عام عدالتوں میں' ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ سمیت' غیر مسلم ججوں کو بھی وہی حیثیت حاصل ہے جو مسلمان ججوں کو اور

شریعت کے ہم آہنگ یا متصادم ہونے کا فیصلہ غیر مسلم ججوں کو نہیں سونپا جا سکتا۔ اس لیے اس کا معقول ترین راستہ فیڈرل شریعت کورٹ کے اختیارات' وسائل اور تعداد میں اضافہ اور لائق' متدین ججوں اور مناسب تعداد میں علما کی شمولیت ہے۔ اس طرح اس مسئلے کو بخوبی حل کیا جا سکتا ہے۔

۷- مطلوبہ دستوری ترمیم میں فیڈرل شریعت کورٹ کے اختیارات کا مسئلہ لازماً طے ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں یہ بات ضروری ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ میں ججوں کی تقرری مستقل ہونی چاہیے اور تقرری' تبادلہ' معزولی' کوئی اور کام سونپنا وغیرہ کے سلسلے میں وہی ضابطہ ہونا چاہیے جو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں ہے۔ نیز اس عدالت کو داد رسی اور عارضی احکام کے اختیارات بھی ہونے چاہییں۔ اسی طرح احتساب کے نظام کو موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ قوانین کے ساتھ ساتھ انتظامی فرمان (executive order) کے لیے بھی کچھ تحدیدات کے ساتھ عدالتی نظرثانی کا دروازہ کھلنا چاہیے اور یہ حق فیڈرل شریعت کورٹ کو حاصل ہونا چاہیے۔

۸- قانون کی تعلیم کے نظام کی فوری تبدیلی اور موجودہ عدلیہ کے تمام افراد کے لیے ہر سطح پر تعلیمی اور تربیتی پروگرام بننے چاہییں۔ ۱۹۸۰ کی اصلاحات میں بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی' جوڈیشل اکیڈمی اور انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اکنامکس اور دعوہ اکیڈمی کا قیام اسی مقصد کی طرف پیش رفت کے لیے تھا۔ اگر ہم فی الحقیقت شریعت کے نفاذ کے باب میں سنجیدہ ہیں تو ان سب پہلوؤں پر فوری توجہ کی ضرورت ہو گی۔ پوری حکومتی اور انتظامی مشینری کو اس کام کے لیے تیار کرنا ہو گا۔ عوام کی تربیت و تعلیم بھی ضروری ہے۔ ان سب پہلوؤں کا احاطہ کیے بغیر محض وقتاً فوقتاً نفاذ شریعت کے اعلان کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا بلکہ ہماری نگاہ میں یہ چیزیں شریعت کی تقدیس کے منافی ہیں' عوام کو مایوس کرنے والی ہیں اور ہمیں ڈر ہے کہ اللہ کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں۔ سیدھا اور سادہ راستہ تو یہی ہے کہ ہم پوری دیانت' اعتماد اور شفاف انداز میں ان تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں جو نفاذ شریعت کے لیے ضروری ہیں' ورنہ کم از کم ایسے اقدامات سے پرہیز کریں جو متفق علیہ معاملات کو بھی متنازع بنانے والے' نت نئی بحثوں کو جنم دینے والے' مخالفین کو نئے حملے کی دعوت دینے والے اور مخلص اور سادہ عوام کو دھوکہ دینے والے ہوں۔ ہمیں اس ارشاد ربانی کو سامنے رکھنا چاہیے کہ:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ○ (ابراہیم ۱۴:۷)

اور یاد رکھو' تمھارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکرگزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا۔ اور اگر کفران نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔

کیا
آپ کے بچے
خون کی کمی کا شکار ہیں

شکریہ ادا کرنا
نیکی کے درخت کو پانی دینا ہے
تاکہ وہ زیادہ پھل لائے

والدین کو یہ حقیقت یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے بچوں کو جو صحت مند خون درکار ہے' وہ ان کی تعریف کرنا ہے' جس میں حوصلہ افزائی کا عنصر بھی شامل ہونا چاہیے۔

انہیں اس نعمت سے محروم نہ رکھیے!
وہ اس طرح خون کی کمی کا شکار ہو سکتے ہیں!!

اگر ہم تعریف جان دار الفاظ میں کسی قدر زور سے کریں اور تنقید کرتے وقت اپنی آواز کم رکھیں تو ہمارے معاشرے میں محبت اور حوصلہ افزائی کا خون گردش کرنے لگے گا۔

(رہنمائے تربیت' ص ۴۳۷)

(یہی تحریکی ذمہ داروں کے لیے بھی ہے!)

خیر خواہ

جدید مسائل

شریعت کے راہ نما اصول

نماز میں لاؤڈ سپیکر کے استعمال کے بارے میں جواب دیتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بیان کردہ وہ اصول پیش کیے جا رہے ہیں، جن سے کسی بھی زمانے میں نئی ایجادات سے پیش آنے والے مسائل کے بارے میں شریعت کی راہ نمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ (مدیر)

۱- سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جزئیات کے متعلق صریح شرعی احکام ہم کو صرف انھی حوادث اور انھی امور کے متعلق معلوم ہو سکتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پیش آئے تھے۔ باقی رہے وہ حوادث جو حضورؐ کے بعد پیش آئے، تو ان کے متعلق شرع میں کوئی صریح حکم نہیں مل سکتا، بلکہ صرف اصول و کلیات شرع ہی سے نکالا جا سکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ نے بعد کے حوادث پر جتنے شرعی احکام لگائے ہیں وہ اسی طرح اصول و کلیات سے اخذ کیے ہوئے ہیں، نہ کہ منصوص۔ اب اگر کوئی ایسا حادثہ [واقعہ] پیش آتا ہے جو صحابہؓ یا ائمہؒ کے دور میں پیش نہیں آیا، یا کوئی ایسی چیز ایجاد ہوتی ہے جو اس دور میں موجود ہی نہ تھی، تو اس کے متعلق متقدمین کے اجتہادی احکام میں کوئی حکم تلاش کرنا بداہتہً غلط ہے۔ ایسے ہر حادثے [واقعے] اور ایسی ہر چیز کے لیے ہم کو بھی اسی طرح اصول و کلیات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس طرح صحابہؓ اور ائمہؒ نے اپنے عہد کے حوادث میں کیا تھا۔

۲- کسی نو ایجاد چیز کے استعمال کو مکروہ یا ناجائز ٹھیرانے کے لیے محض یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ عہد رسالتؐ میں یا عہد صحابہؓ میں، یا عہد ائمہؒ میں موجود نہ تھی۔ تنزیل شرائع سے اللہ تعالیٰ کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ انسان کی قوت ایجاد ایک خاص دور کے بعد ختم ہو جائے، اور اسباب عالم کی تلاش و جستجو اور ان سے کام لینے کے نئے نئے طریقوں کی دریافت کا سلسلہ ایک خاص زمانے تک تو جائز ہو اور اس کے بعد حرام قرار دے دیا جائے۔ جو لوگ سنت اور بدعت کی تعبیر اس طرح پر کرتے ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں پر سب سے بڑا ظلم کرتے ہیں، کیونکہ یہ دشمنان اسلام کے اس الزام کی تصدیق ہے کہ اسلام کوئی دائمی مذہب نہیں بلکہ ایک خاص زمانے کے لیے آیا تھا اور اب اس کے اتباع سے انسانی تمدن کے نشو و ارتقا کا دروازہ بند ہو جاتا

ہے۔

۳۔ تنزیل شرائع سے اللہ تعالیٰ کا اصل مقصد انسان کو وہ اصول سکھانا ہے جن کے تحت وہ اسباب عالم سے غلط کام لینے کے بجائے صحیح کام لے سکے، اور ان کو مضرت کے بجائے حقیقی منفعت اور سچی فلاح کے لیے استعمال کرے۔ ان اصولوں کی محض لفظی تعلیم ہی ہم کو قرآن اور حدیث میں نہیں دی گئی ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جن اسباب عالم پر انسان کو دسترس حاصل تھی، انھیں اسلامی طریق پر برت کر بھی ہم کو بتا دیا گیا ہے کہ آیندہ جن اسباب پر دسترس حاصل ہو، انھیں اس طور پر اور ان مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ صحابہ کرامؓ اور ائمہؒ سلف نے اصول شرع کو اسی اسپرٹ میں سمجھا اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ نئے حوادث اور نئی اشیا پر اصول اسلام کو منطبق کر کے انھوں نے شرع کی ہدایت کو ہمارے لیے اور زیادہ روشن کر دیا۔ اب اگر ہم ان اصولوں کو سمجھ جائیں تو قوائے فطرت میں سے جو نئی قوت ہمارے علم میں آئے گی اور اسباب کائنات میں سے جس نئے سبب پر ہمیں دسترس حاصل ہو گی، اس کے معاملے میں ہم کو ہرگز کوئی حیرانی و سرگردانی پیش نہ آئے گی۔ ہم نہ تو اس اجنبی چیز سے اپرائیں گے اور نہ اس کے سامنے ٹھٹک کر کھڑے ہو جائیں گے، بلکہ اصول شرع میں تدبر کر کے بلاتکلف یہ معلوم کرلیں گے کہ اس کو استعمال کیا جائے یا نہ کیا جائے اور اگر استعمال کیا جائے تو استعمال کا پسندیدہ طریقہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا ہے، اور ناپسندیدہ طریقہ کون سا ہے؟ ہر نئی چیز سے اپرانے اور تمدن کی ترقی کے راستے میں ہر ہر قدم پر ٹھٹک کر کھڑے ہو جانے کی کیفیت جو آج کل پیش آ رہی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شرع کے اصول و کلیات کو سمجھنے کے بجائے ہمارے علما زیادہ تر فقہی جزئیات کے استقصا میں منہمک رہتے ہیں۔

۴۔ قرآن و حدیث سے یہ قاعدۂ کلیہ معلوم ہوتا ہے کہ اشیا میں اصل اباحت ہے تاوقتیکہ عدم اباحت پر کوئی دلیل نہ ہو۔ یعنی ہر چیز کو پاک، حلال اور مباح سمجھا جائے گا جب تک کہ اس کے نجس یا حرام پر کوئی دلیل نہ لائی جائے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعاً (البقرہ ۲:۲۹)

وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعاً مِّنْهُ (الجاثیہ ۴۵: ۱۳)

اور اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمھارے لیے مسخر کر دیا، سب کچھ اپنے پاس سے۔

ان دونوں آیتوں سے ظاہر ہے کہ زمین و آسمان کی ساری چیزیں انسان کے لیے ہیں، لہٰذا انسان ان سے کام لینے اور فائدہ اٹھانے کا مستحق ہے۔ ایک ایک چیز کے لیے الگ الگ اجازت کی ضرورت نہیں، بلکہ جب

تک کسی خاص چیز کے استعمال یا طریق استعمال کی ممانعت نہ ہو' سب چیزوں کو مباح اور طاہر ہی سمجھا جائے گا۔ اسی اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابوداؤد نے سلمانؓ فارسی سے ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْحَلَالُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ فِی کِتَابِہٖ وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ فِی کِتَابِہٖ وَمَا سَکَتَ عَنْہُ فَھُوَ مِمَّا عَفَا عَنْہُ

حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کر دیا۔ رہیں وہ چیزیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا تو وہ معاف ہیں۔

۵- اشیا کی حرمت اور حلت کے احکام جس قاعدے پر مبنی ہیں اس کی تصریح بھی قرآن میں کر دی گئی ہے' یعنی:

وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ (الاعراف ۷:۱۵۷)

(ہمارا نبیؐ) ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔

اور اسی کی تفسیر حدیث میں فرمائی گئی ہے کہ لَاضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِی الْاِسْلَامِ۔ لہٰذا جن چیزوں کی حرمت کا صریح حکم نہیں ہے' ان کے حق میں اس قاعدۂ کلیہ کے لحاظ سے دیکھا جائے گا کہ آیا وہ انسان کے لیے مضرت رساں ہیں یا منفعت بخش۔ اگر مضرت ثابت ہو تو وہ حرام ہیں اور منفعت ثابت ہو تو حلال۔ اسی طرح ان کے طریقہ ہائے استعمال کو بھی اسی قاعدے کے لحاظ سے جانچا جائے گا۔ جو طریق استعمال موجب فساد ہو' وہ ممنوع ہے اور جو طریق استعمال موجب صلاح ہو' وہ مباح ہے۔

۶- منفعت اور مضرت' صلاح اور فساد کے بارے میں بھی شارع نے ہم کو ایک معیار دیا ہے۔ ہم اندھیرے میں نہیں چھوڑے گئے ہیں کہ جس چیز کو چاہیں مفید اور جس کو چاہیں مضر ٹھیرا لیں۔ بلکہ ہمیں چند اصول بتائے گئے ہیں جن کے لحاظ سے فائدے اور مضرت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ انھی اصولوں میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ جو چیز فرائض دینی کی بجا آوری میں مانع ہو' وہ مضر ہے' اس لیے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اور جو چیز اس میں مددگار ہو' وہ مفید ہے۔ اس لیے اس کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے' مثلاً رویت ہلال میں اگر برہنہ آنکھ کی بہ نسبت دوربین کے استعمال سے زیادہ سہولت پیدا ہوتی ہے تو اسے مستحسن سمجھنا چاہیے۔ رمضان میں سحر کا آخری وقت معلوم کرنے کے لیے اور روز مرہ نماز کے اوقات متعین کرنے کے لیے گھڑی زیادہ مددگار ہوتی ہے تو اس کا استعمال بھی مستحسن ہونا چاہیے۔ سفر حج کے لیے اونٹ کی بہ نسبت موٹر یا ہوائی جہاز سے زیادہ سہولت پیدا ہوتی ہے تو اس کا استحسان بھی ناقابل انکار ہے۔ فریضہ جہاد کی بجا آوری میں نیزہ و شمشیر اور اسپ و فیل کی بہ نسبت بندوق' توپ' جنگی جہاز اور ہوائی جہاز زیادہ کارآمد ہیں تو ان کے مستحسن ہونے میں بھی کلام نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص ان چیزوں کے حق میں

حرمت یا کراہت یا توقف کا مسلک اختیار کرتا ہے، محض اس لیے کہ زمانہ سلف میں یہ چیزیں استعمال نہیں ہوئیں، تو وہ روح شرع سے قطعاً بے بہرہ ہے۔

۷- جو چیز کسی ایسے مقصد کے لیے بنائی گئی ہو جسے شرع نے حرام قرار دیا ہے اور اس امر ممنوع کے سوا اس چیز کا کوئی اور استعمال بھی نہ ہو تو اس کے مطلقاً ممنوع ہونے میں کوئی شک نہیں۔ مگر جو چیز اچھے اور برے، مفید اور مضر دونوں طرح کے کاموں کے لیے آلہ کے طور پر کام آتی ہو، اس کو محض اس بنا پر حرام نہیں کہا جا سکتا کہ فاسقین کے ہاتھوں میں اس کا غالب استعمال ممنوعات کے لیے ہے۔ مثلاً گراموفون محض ایک آلہ ہے جس کو اچھے اور برے دونوں مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہم نفس گراموفون کو حرام نہیں کہہ سکتے، بلکہ حرمت کا حکم صرف اس طریق استعمال سے متعلق ہو گا جو شہوات کو ابھارنے والا اور فواحش کی اشاعت کرنے والا ہے۔ (رسائل و مسائل، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، جلد ۱۲، عدد ۶، ص ۴۶۲-۴۶۶، جمادی الاخریٰ ۱۳۵۷ھ، اگست ۱۹۳۸ء)

فریضہ جہاد۔ حکمت اور مقاصد

سید قطب شہیدؒ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ ۲:۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں۔ ہدایت اور گمراہی واضح اور ایک دوسرے سے ممتاز ہو چکی ہیں۔

اس اصول میں اللہ کی طرف سے انسان کا اعزاز اور اس کے ارادے، فکر اور احساسات کا احترام ہے۔ عقیدے اور ہدایت و گمراہی کے امور میں اس کے معاملے کو بالکلیہ اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے اور اس کے اعمال اور نفس کے محاسبے کی ذمہ داری خود اس کے سر ڈالی گئی ہے۔ یہ انسانی آزادی کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ لیکن بیسویں صدی میں بھی ظالم و جابر مسالک اور انسانیت کی تذلیل کرنے والے نظام اور قوانین انسان کو اس بات کی آزادی نہیں دیتے کہ وہ زندگی کے تصور اور اس کے نظم کے سلسلے میں کوئی رویہ اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق اپنا سکے اور اس مسلک سے انحراف و اختلاف کر سکے جو حکومت اپنے ذرائع نشرواشاعت، وسائل تعلیم اور پھر اپنے قوانین اور ضوابط کے ذریعے انسانوں پر مسلط کرتی ہے۔ اس صورت میں لوگوں کے سامنے صرف دو راستے رہ جاتے ہیں، یا تو وہ حکومت کا مسلک اختیار کریں اور اس کے نتیجے میں خدا پر --- جو کائنات کا مالک و متصرف ہے--- ایمان سے محروم ہو جائیں یا موت کا، جو مختلف طریقوں سے ان پر ٹھونسی جاتی ہے، استقبال کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

عقیدے کی آزادی انسان کا اولین حق ہے۔ اسی سے اس کی انسانیت ثابت ہوتی ہے۔ جو شخص انسان سے اس کے عقیدے کی آزادی سلب کر لیتا ہے وہ اس سے اس کی انسانیت سلب کر لیتا ہے۔ عقیدے کی آزادی کے ساتھ عقیدے کی طرف دعوت کی آزادی اور اس راہ میں اذیتوں اور فتنوں سے محفوظ و مامون ہونا بھی ضروری ہے ورنہ یہ نام کی آزادی ہے جس کا عملی زندگی میں کوئی مفہوم نہیں۔

اسلام بلاشک و شبہ کائنات اور زندگی کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور انسانی معاشرے کے لیے موزوں ترین نظام حیات ہے مگر وہ بہ بانگ دہل اعلان کرتا ہے: لا اکراہ فی الدین، "دین میں کوئی جبر نہیں"۔ وہ دوسروں سے قبل اپنے ماننے والوں کو آگاہ کرتا ہے کہ اس دین کے لیے لوگوں کو مجبور کرنا ان کے لیے ممنوع

ہے۔ پھر ان ناقص اور ظالمانہ نظام ہائے زندگی کو، جو اقتدار کی طاقت کے بل پر انسانوں پر مسلط ہو جاتے ہیں اور اپنے مخالفین کو زندہ رہنے کا حق بھی نہیں دیتے، جبر و اکراہ کا کیا حق ہے۔

لا اکراہ فی الدین میں مطلق اور کامل نفی ہے۔ علمائے نحو کی اصطلاح میں نفی جنس، یعنی جنس اکراہ کی نفی، اس بات کی نفی کہ اکراہ پایا جائے۔ یہ نفی عالم وجود اور عالم واقعہ میں جبر و اکراہ کو مستبعد بنا دیتی ہے۔ اس طرح اس جملے میں جبر و اکراہ کی صرف ممانعت نہیں ہے، نہی ہے۔ جب نفی، نفی جنس کی صورت میں ہو تو اس میں زیادہ تاکید اور زیادہ گہرائی ہوتی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لا اکراہ فی الدین، کے اصول پر اس پس منظر میں کچھ گفتگو کر لیں کہ اس اصول کے ساتھ اسلام نے جہاد بھی فرض کیا ہے اور مختلف جنگوں میں حصہ بھی لیا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (البقرہ ۲: ۱۹۳)

ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔

کچھ متعصب دشمنان اسلام اس معاملے میں اسلام پر تضاد کا الزام لگاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک طرف اسلام تلوار اٹھانے کا حکم دیتا ہے اور دوسری طرف اسی لمحے لا اکراہ فی الدین کا اصول بیان کرتا ہے (یہ تضاد نہیں تو اور کیا ہے!)۔ انھی میں کے کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اس بات کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ اسلام پر سے اس اعتراض کو رفع کرنا چاہتے ہیں مگر فی الحقیقت پوری خباثت کے ساتھ ان کی کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں میں روح جہاد سرد پڑ جائے اور اسلام کی تاریخ، اس کے قیام اور دنیا میں اس کے پھیلنے کے سلسلے میں جہاد کا جو کردار ہے، اسے گھٹا دیا جائے۔ یہ لوگ پرفریب، پرپیچ اور خوب صورت انداز میں مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ آج ___ اور آج ہی نہیں، کل بھی ___ جہاد کے ہتھیار کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے! ___ اور یہ سب کچھ وہ اس انداز میں کرتے ہیں، گویا وہ اسلام کے خلاف لگائے جانے والے الزامات کو رفع کر رہے ہوں۔

مستشرقین میں سے یہ دونوں قسم کے لوگ دراصل اسلام سے جنگ کے ایک ہی میدان میں کام کرتے ہیں۔ وہ اسلامی نظام حیات میں تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسلام کی موثر تعلیمات کو، جو مسلمانوں کے احساسات پر اثرانداز ہوتی ہیں، قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ روح جہاد کے ___ جس کے سامنے وہ کسی میدان میں ٹھہر نہیں سکے ___ بیدار ہونے کے خطرے سے محفوظ و مامون ہو جائیں۔ چنانچہ وہ اب بے خوف اور مطمئن ہیں۔ انھوں نے مختلف ذرائع و وسائل اختیار کر کے روح جہاد کو مقید اور مردہ کر دیا ہے، انھوں نے اس روح کو ختم کرنے کے لیے ہر جگہ کاری اور مہلک ضربیں لگائی ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے

دلوں میں یہ خیال القا کیا ہے کہ استعماری طاقتوں اور ان کے اپنے اہل وطن کے مابین عقیدے کی جنگ بالکل نہیں ہے۔ یہ تو صرف منڈیوں' خام مال اور فوجی مراکز و اہم مقامات کی جنگ ہے اور بس۔ اس لیے جہاد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے تلوار اٹھائی ہے۔ اس نے اپنی طویل تاریخ میں مدافعانہ جنگیں بھی کی ہیں اور جہاد بھی کیا ہے۔ لیکن اس نے یہ سب کچھ اس لیے نہیں کیا کہ کسی شخص کو اسلام لانے کے لیے مجبور کیا جائے۔ اس کے کچھ دوسرے ہی اغراض و مقاصد تھے جو جہاد کے متقاضی تھے۔

عقیدے کی حفاظت

اسلام نے جہاد کا حکم اس لیے دیا اور مسلمانوں نے جہاد اس لیے کیا کہ اہل ایمان کو ان ایذا رسانیوں اور فتنوں سے بچایا جائے جن کا وہ شکار تھے اور ان کی جان' مال اور عقیدے کے تحفظ کی ضمانت ہو۔ اس عظیم اصول کو قرآن نے اسی سورت میں اس طرح بیان کیا ہے:

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (البقرہ ۲:۱۹۱)

فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے۔

اس ارشاد خداوندی میں عقیدے پر دست درازی' اس کے سبب ایذا رسانی اور اس کے ماننے والوں کو اس سے زبردستی ہٹانے کی کوشش کو انسانی زندگی پر دست درازی سے زیادہ شدید قرار دیا گیا ہے۔ اس عظیم اصول کی رو سے عقیدہ زندگی سے زیادہ قیمتی ہے۔ جب مومن کو اپنی جان و مال کے تحفظ اور مدافعت کے لیے جنگ کی اجازت ہے تو بدرجہ اولیٰ اسے اس بات کی بھی اجازت ہے کہ وہ اپنے عقیدے اور اپنے دین کے تحفظ اور مدافعت کے لیے جنگ کرے۔ یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کو بہ زور ان کے دین سے ہٹایا جا رہا تھا اور ان کے عقیدے کے باعث انھیں اذیتیں دی جا رہی تھیں اور اس کے سوا ان کے لیے چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اس فتنے کے ازالے کے لیے اپنی عزیز ترین متاع قربان کر دیں۔ مسلمانوں کو ان کے عقیدے سے ہٹانے اور ان کے عقیدے کی وجہ سے انھیں اذیتیں پہنچانے کا عمل زمین کے مختلف خطوں میں برابر جاری رہا ہے۔ اندلس (اسپین) میں مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹانے کے لیے بدترین وحشیانہ تعذیب کا نشانہ بنایا گیا اور ان کا اجتماعی قتل عام ہوا۔ یہی سلوک دوسرے مسیحی ملکوں کے متبعین کے ساتھ بھی کیا گیا تاکہ وہ کیتھولک بن جائیں۔ چنانچہ اسپین میں اب اسلام کا نام و نشان نہیں ہے اور نہ کیتھولک عقیدے کے سوا اور کوئی مسیحی عقیدہ و مسلک باقی ہے۔ اسی طرح بیت المقدس اور اس کے آس پاس کا علاقہ بدترین صلیبی حملوں کا تختہ مشق بنا۔ عیسائیوں کے یہ حملے اسلامی عقیدے کے خلاف اور اسلام کو ختم کرنے ہی کے لیے تھے۔ اور مسلمانوں نے اس علاقے میں ان سے جو جنگیں کیں' وہ صرف عقیدے کے تحفظ کے لیے'

عقیدے کے پرچم کے تحت تھیں۔ وہ ان جنگوں میں غالب و کامران ہوئے اور انھوں نے اس علاقے کو اندلس کے دردناک انجام سے بچا لیا۔ اس صورت حال سے مسلمان زمین کے اطراف و جوانب میں اشتراکیوں' بت پرستوں' صیہونیوں اور مسیحیوں کے علاقوں میں دوچار ہیں۔ اس فتنے کے استیصال کے لیے ضروری ہو گا کہ مسلمان جہاد کریں بشرطیکہ وہ سچ مچ مسلمان ہوں۔

دعوت کے لیے آزادی

اسلام میں جہاد کا دوسرا مقصد عقیدے کی آزادی کے بعد دعوت کی آزادی کا حصول ہے۔ اسلام کائنات اور زندگی کا کامل ترین تصور اور زندگی کے ارتقا کے لیے سب سے زیادہ ترقی یافتہ نظام لے کر آیا ہے۔ وہ اس "خیر کثیر" کو لے کر آیا ہے تاکہ اسے کل نوع انسانی اور سب انسانوں کے کانوں اور دلوں تک پہنچا دے۔ حق کی وضاحت اور تبلیغ کے بعد جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے انکار کر دے' کیونکہ لا اکراہ فی الدین۔ لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس "خیر کثیر" کو جو اللہ کے پاس سے سب انسانوں کے لیے آیا ہے' سب انسانوں تک پہنچانے کی راہ کے موانع کو دور کیا جائے تاکہ لوگ کسی رکاوٹ کے بغیر حق کی دعوت کو سنیں۔ اس کے سلسلے میں اطمینان حاصل کریں اور اگر چاہیں تو کاروان ہدایت میں شامل ہو جائیں۔ ان موانع میں ایک اہم مانع خدا سے باغی اور ظالمانہ نظام ہائے حیات ہیں جو حق کی دعوت کے سننے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور جو لوگ ہدایت پا جاتے ہیں' انھیں راہ حق سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام میں جہاد اس لیے ہے کہ ان باغی اور ظالمانہ نظام ہائے زندگی کا استیصال ہو اور ان کی جگہ وہ منصفانہ نظام قائم ہو' جو ہر جگہ دعوت حق اور داعیان حق کی آزادی کا ضامن ہو۔ یہ مقصد اور یہ ہدف ہمیشہ موجود رہے گا اور اس ہدف تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان جہاد کریں' بشرطیکہ وہ مسلمان ہوں۔

اسلامی نظام کا قیام

اسلام میں جہاد کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ اسلام کا اپنا مخصوص نظام قائم ہو اور اس کا تحفظ ہو۔ اسلام دنیا کا واحد نظام ہے جو دوسرے انسان کے مقابلے میں انسان کی آزادی کا تحفظ کرتا ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ بندگی و غلامی صرف اللہ کے لیے ہے' جو بلند و برتر ہے۔ وہ زمین میں انسان کے لیے انسان کی غلامی کی تمام صورتوں کا خاتمہ کرتا ہے۔ اسلام کی رو سے کسی فرد' کسی طبقے' کسی گروہ اور کسی قوم کو انسانوں کے لیے قانون سازی اور قانون سازی کی راہ سے انھیں ذلیل و خوار کرنے کا حق نہیں ہے۔ سب انسانوں کا ایک ہی رب ہے اور وہی ان سب کے لیے قانون بناتا ہے۔ سب انسان اطاعت و نیازمندی کے ساتھ اسی کی طرف رخ کرتے ہیں جس طرح کہ ایمان اور عبادت کے لیے ان کا رخ تنہا اسی کی طرف ہوتا ہے۔ اس نظام میں کسی انسان کے لیے اطاعت نہیں ہے' الا یہ کہ وہ شریعت الٰہی کو نافذ کرنے والا ہو اور مسلم جماعت کی طرف

سے شریعت کے نفاذ کی ذمہ داری اس پر ڈالی گئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ قانون سازی انسان کا حق نہیں' صرف خدا کا حق ہے اور یہ انسانی زندگی میں خدا کی خدائی کا مظہر ہے۔ اس لیے کسی انسان کو قانون سازی کرنے اور بندہ ہوتے ہوئے الوہیت کے مقام کے مدعی ہونے کا حق نہیں ہے۔

یہ اس خدائی نظام کا' جو اسلام لایا ہے' بنیادی اصول ہے۔ اسی اصول پر اسلام کا پاکیزہ اخلاقی نظام قائم ہوتا ہے' جو ہر انسان کے لیے آزادی کا ضامن ہے۔ یہاں تک کہ ان کے لیے بھی جنھوں نے اسلام قبول نہ کیا ہو۔ اس نظام میں ہر شخص کی تمام حرمتوں کا تحفظ ہوتا ہے یہاں تک کہ ان کی حرمتوں کا تحفظ بھی ہوتا ہے جو اسلام کو اختیار نہیں کرتے۔ اس نظام میں ہر اس شخص کے' جو اسلامی وطن میں رہتا ہو' تمام حقوق محفوظ ہوتے ہیں' خواہ اس کا عقیدہ کچھ بھی ہو۔ اس نظام میں کسی شخص کو اسلامی عقیدہ قبول کرنے یا اسلام کے اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ صرف اسلام کی تبلیغ کی جاتی ہے۔

اسلام نے جہاد اس لیے کیا تاکہ یہ بلند و برتر نظام زمین میں قائم ہو اور اس کا تحفظ ہو۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ طاغوتی نظاموں کو ـــــ جو انسان کے لیے انسان کی بندگی کے اصول پر قائم ہیں' جن میں بندے خدائی کے مقام کے مدعی ہوتے ہیں اور کسی حق کے بغیر وہ عملاً بندوں پر خدائی کرتے ہیں ـــــ ختم کرنے کے لیے جہاد ہو۔ یہ بھی ایک ناگزیر امر ہے کہ یہ طاغوتی نظام ساری زمین میں اسلام سے دشمنی کا اعلان کریں اور اس کی مخالفت و مقاومت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اسی طرح یہ بات بھی ناگزیر ہے کہ اسلام ان نظاموں کو مٹائے تاکہ ان کی جگہ وہ اپنے بلند و برتر نظام کو زمین میں قائم کر سکے۔ اس کے بعد لوگوں کو یہ آزادی ہو کہ وہ اسلامی نظام کے سائے میں رہتے ہوئے جو عقیدہ چاہیں' رکھیں۔ ان کے لیے صرف اتنی بات ضروری ہے کہ وہ اسلام کے اجتماعی' اخلاقی' اقتصادی اور سیاسی قوانین کی پابندی کریں اور بس۔ رہا قلبی عقیدہ تو وہ اس کے سلسلے میں آزاد ہیں۔ اسی طرح انھیں اس بات کی بھی آزادی ہو گی کہ وہ اپنے شخصی معاملات میں اپنے عقیدے کے مطابق عمل کریں۔ اسلامی نظام ان کا سرپرست ہو گا۔ وہ ان کی اور ان کے عقیدے کی آزادی اور ان کے حقوق اور ان کی حرمتوں کا تحفظ کرے گا۔

اس بلند و برتر نظام کی اقامت کے لیے جہاد ہمیشہ مسلمانوں پر فرض رہے گا: حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (البقرہ ۲:۱۹۳) "یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے"۔ یعنی زمین میں بندوں کے لیے اللہ کے سوا کسی کی خدائی اور کسی کی اطاعت نہ رہ جائے۔

مختصر یہ کہ اسلام نے تلوار اس لیے نہیں اٹھائی کہ لوگوں کو اسلامی عقیدہ قبول کرنے پر مجبور کیا جائے اور نہ اسلام اس مفہوم میں تلوار سے پھیلا ہے' جیسا کہ بعض دشمنان اسلام اس طرح کا الزام لگاتے ہیں۔ اسلام میں جہاد اس لیے ہے کہ ایک پرامن نظام قائم ہو' جس کے سائے میں تمام عقیدوں کے ماننے والوں کو

امن و امان حاصل ہو۔ وہ اس کے دائرہ اقتدار میں اس کے اقتدار کے مطیع و فرماں بردار بن کر رہیں۔ اگرچہ انھوں نے اس کا عقیدہ قبول نہ کیا ہو۔

اسلام کی بقا، دنیا میں اس کے پھیلنے، اہل اسلام کے اپنے عقیدے پر مطمئن ہونے اور ان لوگوں کے اطمینان کے لیے، جو اسلام کو قبول کرنا چاہیں، اور اس صالح نظام کے قیام اور اس کے تحفظ کے لیے اسلام کی طاقت ناگزیر ہے۔ اسی لیے جہاد کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہے، نہ آج کے دور یا مستقبل میں اس کی ضرورت ختم ہو گئی ہے جیسا کہ اسلام کے دشمن مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں۔

قوت ناگزیر ہے

اسلام کے لیے نظام ناگزیر ہے۔ اسلام کے لیے قوت ناگزیر ہے۔ اسلام کے لیے جہاد ناگزیر ہے۔ یہ اسلام کی عین فطرت ہے جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ دنیا کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ، یقیناً یہ اسلامی تعلیم ہے لیکن اسلامی تعلیم یہ بھی ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمُ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (الانفال ۸: ۶۰)

جہاں تک تمھارے بس میں ہو اُن (دشمنوں) کے مقابلے کے لیے قوت اور جنگی گھوڑے تیار رکھو، جن کے ذریعے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسرے (دشمنوں) کو ڈراؤ جنھیں تم نہیں جانتے، اللہ جانتا ہے۔

یہ ہے اسلام کی نظر میں اس معاملے کی اصل حیثیت اور مسلمانوں کو اپنے دین اور اپنی تاریخ کی حقیقت کو اسی طرح سمجھنا چاہیے۔ انھیں اپنے دین کے سلسلے میں اس شخص کا موقف اختیار نہیں کرنا چاہیے جو اسلام پر الزام لگا کر پھر اس کا دفاع کرتا ہے۔ انھیں ہمیشہ اس شخص کا موقف اختیار کرنا چاہیے جسے اپنے اصولوں پر اطمینان و وثوق ہے اور جو زمین کے تمام تصورات، تمام نظاموں اور تمام مسلکوں پر اپنے تصورات، اپنے نظام اور اپنے مسلک کی برتری پر یقین رکھتا ہے۔ انھیں ان لوگوں سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے جو ان کے دین کی مدافعت کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر وہ ان کے دلوں کو جذبہ جہاد سے خالی کرنا چاہتے ہیں حالانکہ جہاد ظالم و سرکش باطل کی طاقت کو توڑنے کے لیے ہے۔ جہاد اس لیے ہے کہ کل نوع انسانی اس خیر سے متمتع ہو، جسے اسلام لے کر آیا ہے اور جو شخص اس خیر سے انسانیت کو محروم کرتا ہے، وہ عظیم ترین جرم کا مرتکب اور انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اگر انسانیت کے پاس عقل و فہم ہوتی تو اسے اس دشمن انسانیت کا قلع قمع کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال یہ اہل ایمان کا، جنھیں اللہ نے چنا ہے اور نعمت ایمان سے مالا مال کیا ہے، فرض ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی طاقت کو ختم کر دیں۔ یہ ان پر خود ان کی اپنی ذات کی اور تمام انسانیت کی طرف سے فریضہ ہے اور اس فریضے کے سلسلے میں وہ اللہ کے حضور جواب دہ ہیں۔

(فی ظلال القرآن، جلد اول، ص ۶۸۶-۶۹۳۔ ترجمہ: سید حامد علیؒ)

لایعنی باتوں سے پرہیز

مولانا اشرف علی تھانویؒ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ
انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ لایعنی (غیر مفید) چیز کو ترک کر دے۔

اس ارشاد نبویؐ کو پڑھنے کے بعد خیال ہوتا ہے کہ یہ کون سی خاص ضرورت کی بات ہے' نہ اس میں کسی ثواب کا ذکر ہے' نہ عذاب کا وعدہ اور نہ کسی کام کا حکم۔ لیکن حضورؐ کی تعلیم میں یہی خوبی ہے کہ بڑے بڑے مہلک امراض کا علاج نہایت معمولی باتوں میں کر دیتے ہیں۔ یہ بہ ظاہر معمولی بات ہے لیکن اس کو بجا لانے میں جو منافع ہیں اور ترک میں جو نقصان ہیں' ان کو معلوم کر کے اس کی ضرورت و اہمیت واضح ہو گی۔ اس تعلیم سے بڑی غفلت ہے اور عوام و خواص سب کو ہے۔ گناہ سے تو سب کو ندامت ہوتی ہے لیکن "لایعنی امور" کا ارتکاب کر کے کسی کو ندامت نہیں ہوتی۔ چنانچہ غیبت کر کے پچھتاوا ہوتا ہے مگر ہنسی دل لگی کر کے کوئی نہیں پچھتاتا کہ اے اللہ میں نے فضول وقت ضائع کیا۔

افعال کی تین قسمیں ہیں۔ ایک' وہ جو نافع ہیں' خواہ دین میں یا دنیا میں' ان کا کرنا ضروری ہے۔ دوسرے' وہ جو مضر ہیں' دنیا میں یا آخرت میں' ان کا ترک ضروری ہے۔ تیسرے' وہ جن میں نہ دنیا و دین کا نفع ہے نہ ترک میں نقصان ہے۔ یہ قسم "لایعنی" ہے۔

لہٰذا جو امور نافع ہیں ان کو چھوڑنے کو کوئی نہیں کہتا۔ البتہ وہ ایسے ہونے چاہییں جن سے شریعت میں روکا نہ گیا ہو۔ مثلاً ایک شخص کسی سے سودا کر رہا ہے' اپنا مال دکھا رہا ہے اور وہ جھک جھک کر رہا ہے۔ اگر اس میں ایک گھنٹہ بھی لگ جائے تو کچھ حرج نہیں بشرطیکہ جھوٹ اور فریب سے احتراز کیا جائے۔ ایک شخص اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے امرود کا ٹوکرا سر پر رکھے صدا لگاتا پھرے تو اس کو وہی ثواب ملے گا جو اللہ اللہ کرنے میں ہے۔ ایک پہرے دار رات بھر "جاگو' جاگو" کہے تو یہ بھی ضروری کام میں داخل ہے بلکہ اگر وہ پہرہ چھوڑ کے نفلیں پڑھنے لگے تو وہ خائن ہے۔

دوسری قسم کے افعال جن کا نقصان معلوم ہے' ان سے بچنے کا سبھی اہتمام کرتے ہیں۔ لیکن تیسری قسم یعنی "لایعنی امور" سے بچنے کی کسی کو فکر نہیں ہوتی۔ تسبیح ہاتھ میں ہے لیکن ساتھ ہی ہنسی دل لگی بھی ہو رہی ہے۔ فضول باتوں سے قلب میں وہ ظلمت پیدا ہوتی ہے جس سے ذکر کا سارا اثر دھل جاتا ہے۔ میں حرمت کا فتویٰ نہیں دیتا۔ فتویٰ تو گناہوں سے بچنے کا ہی دیا جاتا ہے۔ لیکن غور طلب بات ہے کہ جن باتوں سے بچنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا حسن قرار دیا ہے' ان کو کرنے میں کیا نقصان ہے؟ وہ حرام اور گناہ نہیں ہیں لیکن حرام اور گناہ کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کثرت کلام دل کو سخت کر دیتی ہے اور زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ "لایعنی باتوں" سے دل مردہ ہو جاتا ہے اور نور جاتا رہتا ہے۔ نور قلب زائل ہونے سے طاعت کا شوق کم ہوتا ہے اور ہمت میں پستی آ جاتی ہے اور جہاں شوق و ہمت میں کمی آئی وہیں گناہوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ گناہوں سے بچنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے: ایک شوق و محبت' دوسرے ہمت۔ آخر کچھ وجہ تو ہے کہ ہمارے ہاں عمل میں بہت کوتاہی ہے۔ نمازیں بھی پڑھتے ہیں' وضو بھی کرتے ہیں لیکن گناہ بھی کثرت سے کرتے ہیں۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ نماز اور وضو سے قلب میں جو نور پیدا ہوتا ہے' وہ "لایعنی امور" سے زائل ہو جاتا ہے۔

یہ "لایعنی امور" بھی تین طرح کے ہیں:

ایک' اقوال یعنی فضول باتیں۔ وقت گزارنے کے لیے دنیا بھر کی باتیں کرنے بیٹھ جائیں۔ اس میں ایک قابل غور چیز فضول قسم کے سوالات اور مسائل میں الجھنا بھی ہے' مثلاً ایک شخص نے ایک بزرگ سے سوال کیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں آپ کے نزدیک کون حق پر تھا؟ فرمایا: میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ قیامت کے دن تم سے اس کے متعلق کوئی سوال نہ ہو گا۔ اسی طرح لوگوں کا مشغلہ ہوتا ہے کہ بیماری' فساد وغیرہ میں بجائے اس کے کہ مجلسوں میں بیٹھ کر خوف الٰہی کے تذکرے کریں اور اپنے اعمال کی اصلاح کی فکر کریں' لایعنی قصے لے بیٹھتے ہیں' آج اتنی موتیں ہوئیں' فلاں جگہ یہ ہوا' فلاں پر یہ گزری' اس قسم کی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔

دوسری قسم' لایعنی افعال ہیں یعنی فضول کاموں میں مشغول ہونا۔ مثلاً ناول اور جھوٹے سچے قصے پڑھنا۔ اس سلسلے میں الاھم فالاھم کا اصول ضرور پیش نظر رہنا چاہیے۔ انسان میں حکمت و سلیقہ ہو تو خود بخود یہ باتیں محسوس ہونے لگتی ہیں کہ کون سا کام مقدم ہے' کس کی زیادہ ضرورت ہے' کس کی کم۔ زیادہ اہم کام کی موجودگی میں کم اہم کام ترک کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ کسی کو نماز سکھانے کے لیے وظیفہ ترک کر دینا چاہیے۔

تیسری قسم، لایعنی اموال سے متعلق ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ مال حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہیں۔ یعنی ایک ذریعہ معاش موجود ہے لیکن بڑے پیمانے پر کارخانہ جاری کرنا چاہتے ہیں۔

یہ بات سمجھنا بھی ضروری ہے کہ کبھی "لایعنی امور" بھی ضروری ہو جاتے ہیں۔ مثلاً امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ جب ذکر سے دل اکتا جائے تو ذاکر پر تھوڑی دیر ہنسنا بولنا بھی واجب ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب نماز پڑھتے پڑھتے نیند آنے لگے تو سو جاؤ۔

مختصر یہ کہ ہر پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے اس حدیث پر عمل کیا جائے تو دل میں ایسا نور اور اطمینان رہے گا کہ اس دولت کے سامنے سلطنت بھی ہیچ معلوم ہو گی۔ کیونکہ اصل راحت اسی کا نام ہے کہ دل کو چین و سکون ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق دے۔ (الابقاء، شمارہ ۶، جلد ۴۹، رجب ۱۳۹۸ھ)

(تدوین: عارفہ اقبال)

انقلاب کا راستہ

ایمان' جہاد اور دعوت

خرم مرادؒ

ہمارا آج کا یہ وسیع و عظیم اجتماع ایک انتہائی مبارک اجتماع ہے۔ اس لیے کہ ہم کو جمع کرنے والی چیز اللہ تبارک و تعالیٰ کا نام ہے۔ اسی کے نام نے ہم کو ایک جماعت میں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کیا' اسی کے نام پر ہم گھروں سے نکلے' اسی کے نام پر ہم نے یہاں یہ بستی آباد کی۔ یہ اجتماع مبارک ہے اور خیر و برکت کا حامل ہے اس لیے کہ یہ اللہ کے نام پر جمع ہوا ہے' اور یہ نام ساری برکتوں کا سرچشمہ ہے' اس لیے کہ یہ رب ذوالجلال والاکرام کا نام ہے۔ تَبٰرَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ○ (الرحمٰن ۵۵ : ۷۸)' "بڑی برکت والا ہے تیرے رب جلیل و کریم کا نام"۔

خدا کا جو نبی آیا وہ ایمان کی پکار بلند کرتا ہوا آیا' وہ اللہ کا نام لیتا ہوا آیا' اس نے امنوا بربکم کی آواز دی۔ ہر زمانے میں اور ہر جگہ' جس جس نے اس صدا پر لبیک کہا وہ ایک ازلی اور ابدی ایمانی قافلے کا حصہ بنتے گئے۔ ہمارا آج کا اجتماع اس لحاظ سے بھی انتہائی مبارک اجتماع ہے کہ یہ اسی ایمانی قافلے کا ایک حصہ ہے۔ اس قافلے کا شروع کا سرا وقت کی اس گھڑی میں ہے جب سارے انسانوں نے اپنے رب سے بندگی کا عہد کیا تھا۔ جب اس نے پوچھا تھا الست بربکم' تو سب نے کہا تھا' "بلیٰ"۔ اور اس قافلے کا آخری سرا وقت کی اس گھڑی میں ہے جب زندگی کی ساری آرزو اور جستجو آخرت میں یوں ظاہر ہو گی:

وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ (یونس ۱۰:۱۰)

اور ان کی ہر بات کا خاتمہ اس پر ہو گا کہ "ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے"۔

اس ایمان کی دعوت ہر زماں میں ایک رہی ہے' اس ایمان کی دعوت ہر مکان میں ایک رہی ہے۔ ابھی آپ نے اسی اسٹیج پر وہ روح پرور منظر دیکھا جب دنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے لوگ' جنھوں نے "اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ" کی پکار پر "اٰمَنَّا" کہا ہے' وہ سب یہاں آکر یک جان دو قالب بن گئے۔ اس ایمانی قافلے کے

قائد' آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک' خدا کے برگزیدہ اور اس کے بھیجے ہوئے بندے رہے ہیں۔ یہ اجتماع مبارک ہے کہ یہ اسی قافلے کا ایک حصہ ہے۔ یہ مبارک اجتماع جو آج یہاں پاکستان کے گوشے گوشے سے کھنچ کر جمع ہوا ہے' اپنے رب کے نام پر جمع ہوا ہے' اور اپنے رب کے نام کو' اس کے کلمے کو' اس کے دین کو بلند کرنے کے لیے جمع ہوا ہے۔

میرے بھائیو اور بہنو! میں دل کی ایک بات بھی یہاں پر کہتا چلوں۔ اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے زمانے کے فاصلوں کو سمیٹ دیں' شہر کی فصیلوں کو گرا دیں' اپنی نگاہیں پھیر کر پیچھے کی طرف دیکھیں' تو آج سے ۴۸ سال پہلے کا وہ منظر آپ دیکھ سکتے ہیں جب ۷۵ آدمی کھڑے ہو کر اپنے عہد ایمان کی تجدید کر رہے تھے۔ کوئی گڑگڑا رہا تھا' کوئی گریہ و زاری کر رہا تھا' لیکن سب اپنے رب سے عہد وفا تازہ کر رہے تھے۔ ہم سب نہ صرف انبیا کرام کی اس دعوت ایمان کے وارث ہیں' جو "امنوا بربکم" کی صدا میں دی گئی تھی' بلکہ ہم خود اپنے اس قافلے کے آغاز میں تجدید ایمان کی اس روایت کے بھی وارث ہیں جس پر اس کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ اسی ایمان کی تاثیر ہے' اسی ایمان کی قوت ہے کہ ۷۵ آدمیوں کا وہ چھوٹا سا گروہ آج کروڑوں انسانوں پر مشتمل ہے۔ یہاں سے چند میل دور اسلامیہ پارک کے ایک چھوٹے سے مکان میں جو انسان جمع ہوئے تھے' وہ آج ایک سیل رواں بن چکے ہیں جو دنیا کے ایک گوشے سے لے کر دوسرے گوشے تک بہہ رہا ہے۔ یہ سب ایمان کا کرشمہ ہے' وہ ایمان جس کی صدا ہر نبی اور رسول نے بلند کی۔

آج کا یہ اجتماع اس لیے بھی مبارک ہے کہ اس کی منزل اسلامی انقلاب ہے۔ اسلامی انقلاب ہمارے دلوں میں' اسلامی انقلاب ہمارے گھروں میں' اسلامی انقلاب ہمارے ملک میں' اور اسلامی انقلاب آخر کار ساری دنیا میں۔ یہ انقلاب ایمان ہی کی تفسیر ہے۔ ایمان جو کچھ کہتا ہے' وہی اسلامی انقلاب ہے۔ ایمان زندگی میں مکمل تبدیلی لاتا ہے۔ ایمان سے انسان کے دل کی دنیا بدل جاتی ہے' اس کے سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے' اس کے اخلاق بدل جاتے ہیں' اس کے اعمال بدل جاتے ہیں' گویا کہ زمین بدل جاتی ہے' آسمان بدل جاتا ہے۔ ہمارا یہ اسلامی انقلاب' ایمان کے تقاضوں سے تنکا برابر کم نہیں' اور نہ تنکا برابر زیادہ ہے۔ اسی اسلامی انقلاب کا نام ہم بلند کرتے ہیں' اسی انقلاب کے عزم کے ساتھ جمع ہوئے ہیں۔

اسلامی انقلاب کا عزم دراصل عہد ایمان وفا کرنے کا عزم ہے۔ یہ عزم اللہ کے نام پر مرنے کا' اللہ کے نام پر جینے کا' اللہ کے نام کے ساتھ جڑ جانے کا عزم ہے۔

یہ اللہ کا نام بھی کیسا بابرکت نام ہے! جب پہلی وحی آئی' تو یہ حکم لائی کہ اپنا رشتہ صرف اسی کے نام کے ساتھ جوڑو' ساری زندگی کا تعلق اسی کے ساتھ قائم کرو۔ پھر ہدایت کے بعد ہدایت آئی کہ راتوں کو کھڑے ہو تو اس کا نام لو' سب سے کٹ کر اس کے نام کو یاد رکھو' صبح شام اس کا نام لیا کرو' اٹھو' بیٹھو' لیٹو'

اس کا نام لو۔ انسان کے لیے' اپنے دل کی دنیا کے لیے' اپنے گھر کی دنیا کے لیے' اپنے ملک کے لیے' اگر خیرو برکت ہے تو اس کے نام میں ہے جس پر ایمان کی پکار ہے' جو رب ہے' جس نے پیدا کیا۔ وہ ایمان جو علم کو' زندگی کو' ہر چیز کو رب ذوالجلال والاکرام کے اس نام کے ساتھ جوڑتا ہے جو برکت ہی برکت ہے۔

میرے بھائیو اور بہنو! عمل کی دنیا میں ایمان کی تعبیر جہاد ہی ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ جب بعض لوگوں نے یہ سنا کہ ایمان لاؤ' تو وہ بول اٹھے کہ ہم ایمان لائے' پھر یہ نہیں بتایا گیا' یہ بیان نہیں کیا گیا' کہ اس ایمان کی تعبیر اور تفسیر کیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دوسرے ہی انداز میں ایمان کے معنی کھول دیے۔ ایمان لانے والوں کے عمل کی زبان میں' نہ کہ الفاظ میں۔ فرمایا' ایمان لانے والے وہ تھے جنھوں نے ہر چیز کو میرے لیے چھوڑ دیا' جو صرف مجھے اپنا رب کہنے کے جرم میں اپنے گھروں سے نکالے گئے' جن کے اوپر میری راہ چلتے ایذاؤں اور تکالیف کے پہاڑ توڑ دیے گئے' جو باطل کے آگے سینہ سپر ہوگئے' اور جنھوں نے آخرکار عہد ایمان کی وفا میں اپنی جان کی نذر پیش کر دی۔ یہ ہے ایمان کی حقیقت' ایمان کا راستہ' جو قرآن مجید نے کھول کر بیان کر دیا ہے۔

ایمان اور جہاد کا ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ لازم اور ملزوم کا رشتہ ہے۔ ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا' کوئی ان کو الگ نہیں کر سکتا۔ یہ ممکن نہیں کہ آدمی مومن ہو اور وہ مجاہد نہ ہو۔ قرآن نے اس بات کو یوں بیان کر دیا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ (الحجرٰت ۴۹: ۱۵)

حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔

گویا مومن تو وہ ہیں جو صحیح معنوں میں ایمان لائے۔ جن کو راہ ایمان میں نہ شک ہو نہ شبہ' نہ تردد ہو نہ ہچکچاہٹ۔ سارے کانٹے نکل گئے' یکسو ہو گئے۔ جنھوں نے اپنے عہد ایمان کو وفا کیا' سب کچھ اللہ کے حوالے کر دیا' اس کی راہ میں مال لگا دیا' جان لگا دی' سب کچھ لگا کر جہاد کیا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ' پس یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہیں۔

اللہ کو اپنا رب ماننا صرف ایک بات زبان سے کہہ دینے کا نام نہیں۔ یہ اتنا آسان نہیں' لیکن کوئی بہت مشکل یا ناممکن کام بھی نہیں۔ اللہ کا نام لینے' اللہ کو رب ماننے کے بعد اس پر جمنا ضروری ہو جاتا ہے۔ استقامت کی راہ پکڑنا ہوتی ہے۔ استقامت کے لفظ میں ہی ایمان کی ساری حقیقت پوشیدہ ہے۔ ایمان ایک دعوت انقلاب ہے' خود ایک انقلاب ہے۔ جو ایمان لانے کے بعد اپنے ایمان پر جم جائیں' انھی کے اوپر خدا

کے فرشتے اترتے ہیں۔ جو اللہ کا نام لیں اور کہیں کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ان کا فرض ہے کہ وہ اس نام کے لیے کھڑے ہو جائیں اور کھڑے ہو کر اس کا اعلان کریں۔ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الکہف ۱۸: ۱۴)۔

یہ ایمان اور یہ جہاد ہی وہ دو چیزیں ہیں جن سے اسلامی انقلاب کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ جو زندگی ایمان کے نور سے منور ہو گی، جو زندگی جہاد کی راہ پر گامزن ہو گی، وہی زندگی اسلامی انقلاب کی منزل سے ہمکنار ہو گی۔ ایمان کا چراغ آپ اپنے دل کی محراب میں روشن کر دیں، یہاں تک کہ آپ کی پوری زندگی منور ہو جائے۔ اپنے دل میں ایمان کا شعلہ اس طرح سجائیں کہ وہ ستارے کی طرح چمک کر ساری دنیا کو زندگی کی نئی راہیں دکھائے۔ ایمان کا بیج اپنے دل کی کھیتی میں ڈالیں، آرزو اور جستجو، اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کے پانی سے اس کی آبیاری کریں، تو وہ تناور درخت نمودار ہو گا جس کے پھل ساری انسانیت سدا کھاتی رہے گی۔

بھائیو اور بہنو! اس ایمان کی روشنی اپنے دل میں سجایئے، اس کو ستارے کی طرح چمکایئے، اس کو دنیا کا، اپنے ملک کا، اپنی قوم کا، اپنی زندگی کا رہبر بنایئے۔

جاننے کی ضرورت ہمیں اس بات کی ہے کہ اگر انقلابی کردار ایمان اور جہاد سے بنتا ہے، وہ انقلابی کردار جس کے بغیر ہم اسلامی انقلاب کی منزل سے ہمکنار نہیں ہو سکتے، تو پھر ایمان کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ ایمان کی حقیقت جاننا اور سمجھنا ہو تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا صرف ایک جملہ ایمان کی ساری حقیقت آشکار کر دیتا ہے۔ فرمایا: اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ (الانعام ۶: ۷۹) "میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں"۔ یعنی میں نے اپنی شخصیت کا، اپنی زندگی کا، رخ ہر طرف سے کاٹ کر صرف اس کی طرف کر لیا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ گویا میں سب سے کٹ کر صرف اس سے جڑ گیا ہوں، وہی میرا مقصود و منزل بن گیا ہے اور میں اس میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ گویا نہ رخ کسی اور کی طرف کرتا ہوں، نہ مقصود و منزل کسی اور کو بناتا ہوں، نہ شخصیت اور زندگی کے حصے بخرے کرتا ہوں کہ ایک کا رخ کسی طرف ہو، دوسرے کا قبلہ کچھ اور ہو۔

جب آپ نے اپنا رخ، اپنے چہرے کا رخ، اپنی زندگی کا رخ اللہ کی طرف کر لیا، اور صرف اسی کی طرف کر لیا، تو آپ نے ایمان کے معنی پا لیے۔ اس کے بعد اللہ ہی زندگی کا مقصد ہے، وہی قبلہ ہے، وہی مطلوب ہے، اسی کی طرف چلنا ہے، اسی کی طرف دوڑنا ہے۔

اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے نماز کو دیکھیے۔ جب آپ نماز پڑھتے ہیں، اگر آپ کا رخ قبلہ

کی طرف نہ ہو تو آپ کی نماز صحیح نہیں ہوتی۔ اسی طرح زندگی کا رخ اللہ کی طرف نہ ہو بلکہ کسی اور طرف ہو جائے، اس کا مقصود اللہ نہ ہو کوئی اور ہو جائے، اللہ کی رضا نہ ہو بلکہ دنیا یا کسی اور کی رضا ہو جائے، وہ زندگی ایمان کی زندگی نہیں بن سکتی۔ وہ بغیر قبلہ کا رخ کیے نماز کی طرح باطل ہے، مقبول نہیں۔

ایمان اس کا نام بھی ہے کہ آپ اپنی پوری زندگی کا سودا صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ چکا لیں، اس قیمت کے عوض کہ وہ آپ کو اپنی رضا و خوشنودی اور جنت سے سرفراز فرمائے گا۔ ان لوگوں میں سے ہو جائیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (البقرہ ۲: ۲۰۷)

دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے۔

یعنی بعض لوگ ہیں جو اپنے آپ کو فروخت کر دیتے ہیں، اللہ کی رضا کے حصول کے لیے۔ جب آپ اپنے آپ کو ہر طرف سے کاٹ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑ دیں اور صرف اسی کے ہو رہیں، جب آپ کا مقصود اور مطلوب صرف اللہ تعالیٰ کی رضا بن جائے اور آپ کی نگاہیں اس جنت کے اوپر جم جائیں جس کی وسعت میں زمین اور آسمان سما جائیں، تو یہی وہ ایمان ہے جو آپ کو، آپ کی تحریک کو، آپ کی جماعت کو، اسلامی انقلاب کی منزل سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

یہ ایمان آپ کو کتنا حاصل ہے؟ یہ میرے کہنے کی بات نہیں، آپ کے جانچنے اور دیکھنے کی بات ہے۔ اپنے گریبان کے اندر منہ ڈال کر، اپنے دل کے اندر جھانک کر دیکھیے، اس کا رخ کس طرف ہے اور وہاں کون کون حکومت کر رہا ہے، آپ کی نگاہیں کن مقاصد پر جمی ہوئی ہیں۔ ہر کام اللہ کے لیے خالص کر لیجیے، اسی کے مخلص بن جائیے، ہر چیز اللہ کے لیے کر دیجیے، اسی کے بن جائیے۔ اس کے بعد آپ ایمان کی حقیقت پائیں گے، ایمان آپ کے لیے لذیذ شے بن جائے گا۔

آپ نے ایمان کی یہ حقیقت پالی، تو پھر آپ کو سب سے بڑھ کر محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو گی۔ ایمان کی یہی تعبیر ہے جو قرآن پاک میں بیان کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ ۲: ۱۶۵)۔ وہ لوگ جو ایمان لانے والے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ محبت سے زیادہ سچی، محبت سے زیادہ حسین، اور محبت سے زیادہ دلکش کوئی تعبیر ایمان کی ہو نہیں سکتی۔ محبت کا رشتہ دل کا رشتہ ہے، محبت کا رشتہ قربت کا رشتہ ہے، محبت کا رشتہ عمل کا رشتہ ہے، محبت کا رشتہ یاد کا رشتہ ہے۔ محبت کا مسکن دل ہوتا ہے۔ جو محبوب ہوتا ہے اس کی یاد دل میں بستی ہے۔ جو محبوب ہوتا ہے اس سے ملاقات کی تمنا دل کو بے کل رکھتی ہے۔ جو محبوب ہوتا ہے اس کی خاطر دل سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ جو محبوب ہوتا ہے اس کے کوچے میں جانے کے لیے دل بے قرار رہتا ہے، اور دن رات

اس کی طرف چلنے کے بعد بھی دل نہ تھکتا ہے' نہ سیر ہوتا ہے۔ محبوب کے سامنے حاضر ہوتا ہے تو دل بھی حاضر ہوتا ہے' اور محبوب کا اشارہ ہوتا ہے دل اپنا سب کچھ لا کے حاضر کر دیتا ہے' اپنا مال بھی' اپنی زندگی بھی' اپنے رشتے بھی' اپنے تعلقات بھی' اور جب ضرورت ہو تو اپنی جان بھی۔ یہی محبت انقلابی ایمان کی تعبیر ہے' یہی محبت انقلابی ایمان کی مظہر ہے۔ یہی محبت انقلابی ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ محبت تو اللہ کے برگزیدہ بندوں کا مقام ہے۔ وہ غلط سمجھتے ہیں۔ قرآن تو کہتا ہے کہ مومن ہے ہی وہ جو اللہ سے محبت کرے' اور سب سے بڑھ کر اسی سے محبت کرے۔

محبت کے بعد' جس ایمان سے انقلابی کردار بنتا ہے' وہ وفاداری اور اطاعت کے عہد کا نام ہے۔ ایمان صرف زبان سے اقرار کا نام نہیں ہے' ایمان اللہ تعالیٰ سے معاہدے کا نام ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَاَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ (التوبہ ۹:۱۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں"۔ گویا ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے آپ کے جسم و جان اور مال خرید لیے ہیں۔ ہر چیز آپ نے اس کو بیچ دی ہے۔ اب کوئی چیز آپ کی نہ رہی۔ نہ ہاتھ پاؤں آپ کے رہے نہ آنکھ اور کان' نہ دل و دماغ آپ کے رہے' نہ گھربار اور کاروبار' سب اللہ کے ہو گئے۔

آپ نے تجدید ایمان کر لی' آپ راہ حق پر آ گئے' آپ نے اسلامی انقلاب کا جھنڈا ہاتھ میں اٹھا لیا' آپ نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر دیا' آپ اللہ کی کبریائی کے لیے کھڑے ہو گئے' لیکن اگر آپ کا حال یہ ہو کہ آپ نے اپنا مال بھی اس سے بچایا' کہیں اور لگایا یا سینت کر رکھا' اپنے وقت کو بھی اس سے بچایا' اپنی توجہات کو بھی بچایا' اپنے تعلقات کو بھی بچایا' تو پھر یہ ایمان وفائے عہد نہیں' نقض عہد ہے۔ یہ ایمان انقلابی ایمان نہیں جو آپ کو اسلامی انقلاب کی منزل سے ہمکنار کر دے۔

سب سے بڑھ کر' انقلابی کردار کے ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں کہیں ظلم کی آمیزش نہ ہو۔ ظلم کے معنی کیا ہیں؟ ظلم کے معنی یہ ہیں جو کچھ صرف اللہ کا ہونا چاہیے آپ کسی اور کا کر دیں' یا اس میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کا حصہ لگا دیں۔ کسی اور کو شریک کر لیں۔ ایک قسم کے شریک تو وہ ہوتے ہیں جو نظروں سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ پتھر ہو سکتے ہیں' درخت ہو سکتے ہیں' چاند تارے ہو سکتے ہیں' اپنے جیسے انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں جو نظر نہیں آتیں' مگر جو چھپ چھپ کے آپ کے دلوں میں وہ جگہ پا لیتی ہیں جو خدا کی جگہ ہے' آستینوں کے بت بن جاتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے الفاظ میں وہ شرک بڑا خطرناک ہے جو ایک کالی چیونٹی کی طرح سیاہ چٹان کے اوپر رینگتا ہے اور کوئی اس کو نہیں پہچانتا۔ اس کو دیکھنا بھی مشکل' اس سے ہوشیار رہنا بھی مشکل' اس

سے بچنا بھی مشکل۔ اپنی خواہش نفس، اپنی پسند ناپسند، اپنی شہرت، اپنا جذبہ انتقام، اپنی عصبیت، اپنی انا، ان میں سے جو بھی اللہ کے ساتھ، اللہ سے زیادہ یا اللہ کے برابر، محبت و اطاعت اور وفاداری کا مرکز بن جائے، وہی اللہ کا ہمسر اور اس کا شریک ہے۔ ان کو اپنا معبود بنانا، یہ وہ چیز ہے جس سے ایمان کو پاک ہونا چاہیے۔ جس کو ایسا خالص ایمان حاصل ہو، اس سے ہی اللہ تعالیٰ اس انقلاب کا وعدہ فرماتا ہے کہ وہ زمین میں ان کو خلافت عطا کرے گا، لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ --- يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (النور ۲۴: ۵۵) یعنی جن کی بندگی اللہ کے لیے اس طرح خالص ہو کہ اس میں شرک کی کوئی ملاوٹ نہ ہو۔

میرے بھائیو اور بہنو! سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب ایمان اس طرح دلوں کے اندر راسخ ہو جائے تو انقلابی کردار بنتا ہے، جب انقلابی کردار بنتا ہے تو پھر آپ کا ہر کام صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہونا چاہیے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام ہو یا بڑے سے بڑا۔ جان دینی ہو تو صرف اللہ کے لیے ہو، اور ایک منٹ کے لیے اجتماع میں بیٹھنا ہو تو وہ بھی صرف اسی کے لیے ہو۔ زبان سے نعرہ لگانا ہو تو اسی لیے ہو، اور ہاتھ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا ہو تو وہ بھی اسی لیے ہو کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو، اللہ تعالیٰ خوش ہو۔

اگر صرف اللہ کی رضا ہی مطلوب ہو جائے، تو ان کو جو اسلامی انقلاب کی راہ پر گامزن ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ انقلابی کردار ایمان اور جہاد پر مشتمل ہے، یہ بات اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اللہ کی رضا کوئی ایسا کام کر کے ہرگز بھی حاصل نہیں ہو سکتی جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہو، جس سے اس کا غضب بھڑکتا ہو۔ یہ شیطان کے وسوسے ہوتے ہیں، شیطان کے دھوکے ہوتے ہیں کہ تم نے فلاں کام نہ کیا تو تم کامیاب نہیں ہو گے، انقلاب نہیں آئے گا، اور تم لوگوں میں مقبول نہیں ہو گے تو تحریک کیسے آگے بڑھے گی۔ لیکن یہ بات گرہ میں باندھ لیجیے، اچھی طرح اپنے دل پر لکھ لیجیے کہ جس کام یا بات سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہو وہ کر کے اس کی رضا حاصل نہیں ہو سکتی، اور جس کام کو کر کے اس کی رضا حاصل نہ ہو اس کام سے اسلامی انقلاب کی راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔ اس بات پر یقین حاصل ہو جائے تو صحیح فکر اور سلامت روی یقینی ہو سکتی ہے، توکل اور صبر کا وہ خزانہ حاصل ہوتا ہے جس کی کوئی حد نہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ اگر انقلابی ایمان کا نور آپ کے دل کی روشنی بن جائے، دل اس کے لیے کھل جائے، آپ اس روشنی میں زندگی کی راہ چلیں تو پھر کیفیت یہ ہوتی ہے کہ دنیا سے دل کا تعلق کٹ جاتا ہے۔ دنیا سے تعلق کٹ جانے کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ آدمی گوشہ گیر ہو جاتا ہے، ترک دنیا کر کے کسی غار یا صحرا میں جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ نہیں، وہ خوب جانتا ہے کہ یہی دنیا ہے جس کے ذریعے اس کو اللہ کی رضا حاصل کرنی ہے۔ اس دنیا میں اس کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہی وہ آخرت میں اللہ سے ملاقات کے وقت سرخرو ہو سکتا ہے۔ بس یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ دنیا آپ کا مسکن نہیں، یہ دنیا آپ کی منزل نہیں، یہ

دنیا آپ کا مقصود نہیں' یہ دنیا آپ کی محبوب نہیں۔ محبوب و مطلوب تو بس وہی کچھ ہے جو موت کے بعد ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (الزمر ۳۹: ۲۲)' "اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے (اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے ان باتوں سے کوئی سبق نہ لیا؟)"۔ گویا جس کا سینہ اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے وہ اپنے رب کی طرف سے نور پا لیتا ہے۔ جس کے دل میں ایمان کا نور داخل ہو جائے' اس میں فراخی پیدا ہو جاتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا' یارسولؐ اللہ' اس کی علامت بیان فرمایئے۔ ارشاد ہوا' آخرت کی طرف میلان ہو' دنیا سے بے رغبتی اور یکسوئی ہو' موت سے پیشتر اس کی' یعنی' اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تیاری ہو۔ یہی بات ہمارے پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور انداز میں یوں بیان فرمائی' وَاقْطَعْ عَنِّیْ حَاجَاتِ الدُّنْیَا بِالشَّوْقِ اِلٰی لِقَائِکَ۔ یعنی اللہ سے ملاقات اس طرح محبوب ہو جائے' اللہ سے ملاقات کا شوق اس طرح دل میں اتر جائے کہ دنیا کی حاجتیں' دنیا کی چاہتیں' دنیا کی تمنائیں' دنیا کے مطالبات' ان سب کی جڑ کٹ جائے۔

ایمان انقلابی کردار کو ایسی تازگی عطا کرتا ہے جو لازوال ہے۔ آپ اللہ کی رضا کے طلب گار ہیں' آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے معنی اس کی جنت ہے' وہ جنت جس کی وسعت میں زمین اور آسمان سما جائیں۔ اگر آپ کا مقصود اور مطلوب واقعی وہ جنت ہے جس کی وسعت میں زمین اور آسمان سما جائیں' تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ کے ایمان کو' اور اس پر قائم انقلابی کردار کو کم سے کم اتنا سدا بہار' اتنا سرسبز اور اتنا ابدی تو ہونا چاہیے' جتنی جنت سرسبز ہے' جتنی جنت سدا بہار ہے' جتنی جنت ابدی ہے۔ جو ایمان آج ہے اور کل نہ ہو' جو ایمان گردش زمانہ سے سرد پڑ جائے' باطل سے شکست کھا جائے' آزمائشوں میں ترغیب و خوف کا شکار ہو جائے' آخری سانس تک سلامت نہ رہے' جو ایمان دنیا کی ایک لہر میں بہہ جائے' وہ ایمان اس جنت میں کیسے لے جا سکتا ہے' جو ابدی ہے۔ انسان کی فطرت ایسی ضرور ہے کہ حالات کے لحاظ سے ایمان پر کیفیات کے مختلف ادوار آ سکتے ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ کو وہ ایمان مطلوب ہے جو ہر اتار کے بعد اور زیادہ اوپر اٹھ جائے' ہر خزاں کے بعد اور زیادہ رنگ لائے اور مہکے' جو آخری سانس تک جان زندگی بنا رہے۔

جس نے اپنا پورا رخ صرف اللہ کی طرف کر لیا' اور اس بات کو جان لیا اور مان لیا کہ ساری قوتوں کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ ہے' مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (الکہف ۱۸: ۳۹)' وہی سب سے بڑا ہے' اللہ اکبر' تو آپ بتایئے کہ اس کے بعد کائنات کے اندر کون سی دولت ہے جس کا لالچ ایمان کو متزلزل کر دے' یا

کون سی قوت ایسی ہے جس سے خوف اور ڈر ایمان کو کمزور کر دے یا ضائع کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کون سی قوت ایسی ہے، جس سے آپ امیدیں باندھیں، کون سی قوت ایسی ہے جس کا آپ آسرا اور سہارا لیں۔ کوئی آسرا نہ ہو، کوئی سہارا نہ ہو، کوئی اسباب نہ ہوں، بڑی سے بڑی قوت آپ کی مخالف ہو، لیکن اگر آپ نے رب سے ایمان کا رشتہ جوڑ لیا، اپنے دل میں ایمان کا چراغ جلا لیا، اپنی کھیتی میں ایمان کا بیج ڈال دیا، تو اب آپ کے سامنے کوئی قوت، قوت نہیں ہے۔ سارے سہارے ٹوٹ جائیں تو اس کا ایک سہارا تو ہے، کوئی قوت ساتھ نہ دے تو اس کی قوت تو ساتھ ہے۔ اس کے سہارے اور اس کی قوت سے بڑا کوئی سہارا اور کوئی قوت نہیں ہے۔

جب ایمان اس مقام پر پہنچ جائے تو وہ ایک ایسا لباس نہیں ہو سکتا جسے آپ جب چاہیں اوڑھیں اور جب چاہیں اتار دیں۔ بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ ایمان کی مٹھاس، ایمان کی حلاوت، آپ کی زبان محسوس کرتی ہے، آپ کی روح اس کا ذائقہ چکھتی ہے، آپ کا دل اس کے مزے لوٹتا ہے، آپ کی زندگی میں اس کی شیرینی کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہ وہ ایمانی کردار ہے، یہ وہ انقلابی کردار ہے، جس کو حاصل کر کے ہم اپنے اس قافلے کو پاکستان میں، اور ساری دنیا میں اسلامی انقلاب کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں۔

میرے بھائیو اور بہنو، میں نے آپ سے کہا تھا کہ ایمان کی حقیقت، اس کی تعبیر، اس کی کسوٹی جہاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی ایمان مقبول ہے جو جہاد کی راہ پکڑے۔ آپ ایمان کی حقیقت پر غور کریں تو آپ خود اس نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں۔

ایک ننھے سے بیج کو دیکھیے۔ منوں مٹی کے نیچے دبا ہوا ہوتا ہے، لیکن وہ مٹی کا پہاڑ چیر کر باہر نکلتا ہے۔ ننھی منی کونپل نکلتی ہے، پھر وہ ایک مضبوط، توانا اور تناور درخت بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح ایمان کی یہ سرشت ہے، ایمان کی یہ فطرت ہے، اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے، یہ استعداد رکھی ہے، کہ باہر نکلے، ظاہر ہو اور توانا بن جائے۔ مزاحمت کرے، مقابلہ کرے اور جو چیز بھی ایمان کا راستہ روکنے والی ہو، اس کو راستے سے ہٹا دے۔ گویا ایمان کا راستہ جہاد کا راستہ ہے۔

اس امت کی قوت اور عروج کا راز ایمان اور جہاد کے رشتے میں پوشیدہ تھا۔ اس امت پر زوال اس وقت آنا شروع ہوا جب ایمان اور جہاد کا رشتہ کٹ گیا، جب لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ایمان کا جہاد سے تعلق ناگزیر نہیں ہے۔ آدمی بڑا اچھا مومن ہو سکتا ہے، بڑا باکمال ہو سکتا ہے، اس کے بغیر کہ وہ جہاد کرے۔ حالانکہ قرآن کی ایک ایک آیت کھول کر یہ بات بیان کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی ایمان مقبول ہے، وہی مطلوب ہے، جس کا نتیجہ جہاد ہو۔ بار بار فرمایا گیا، کہ جو ایمان لانے والے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جہاد سے

کوئی عذر نہیں پیش کرتے' کوئی بہانے نہیں بناتے' ہر وقت جان اور مال لیے جہاد کے لیے حاضر رہتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ایمان اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ آپ کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی ہو جائے۔ اور یہ ہو نہیں سکتا جب تک آپ اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق بنانے کے لیے جدوجہد نہ کریں اور کوشش نہ کریں۔ جہاد کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں آپ کو جو کچھ بھی دیا ہے--- آپ کا وقت' آپ کا جسم' آپ کی صلاحیتیں' آپ کا مال--- ان میں سے ہر چیز اللہ کے لیے اور اللہ کے دین کے لیے وقف ہو جائے۔ یہ سب کچھ اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے' اس کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے' اس کے دین کو ظاہر کرنے کے لیے' اس کے کام میں لگ جائے۔ جہاد نہ ہو تو ایمان صحیح معنوں میں انقلابی ایمان نہیں ہے۔ جب ایمان اور جہاد جڑ جاتے ہیں اور ان کا تعلق کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے' زندگی اس تعلق کے محور پر گھومنے لگتی ہے' تو پھر وہ کردار وجود میں آتا ہے جو اسلامی انقلاب لا سکتا ہے۔

ایمان اور جہاد کے درمیان جو چیز ربط قائم کرتی ہے وہ دعوت ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کو بلایا جائے اور وہ اللہ کی بندگی پر جمع ہو جائیں۔ جہاد بھی اسی وقت ہو سکتا ہے جب لوگ اس مقصد کے لیے جمع ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اختیار کی آزادی دی ہے' اس بات کی آزادی دی ہے کہ ہم چاہیں تو اچھے عمل کریں اور چاہیں تو برے عمل کریں' اس بات کی آزادی دی ہے کہ ہم چاہیں تو اللہ تعالیٰ کا انکار کریں اور اس کی ناشکری کریں اور چاہیں تو اس کو مانیں اور شکر کا راستہ پکڑیں۔ فرمایا: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا○ (الدھر ۷۶: ۳)' "ہم نے انسان کو راستہ دکھا دیا ہے۔ وہ چاہے تو شکر کا راستہ اختیار کرے' اور چاہے تو ناشکری کا راستہ اختیار کرے"۔

یہ سارے لوگ جو زمین پر بستے ہیں' ان کو ایمان اور جہاد پر لانے کا راستہ دعوت کا راستہ ہے۔ دعوت و تبلیغ ہی رسالت کا راستہ ہے۔ اللہ کا ہر رسول داعی بن کر آیا تاکہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے۔ داعیاً الی اللہ۔ وہ چراغ بن کے آیا تاکہ لوگوں کو روشنی دکھائے۔ سراجاً منیراً۔ بلانے کے لیے اور روشنی دکھانے کے لیے' وہ بشارت دینے والا بن کے آیا تاکہ لوگوں کے اندر امید کے چراغ جلائے۔ وہ آگاہ کرنے والا بن کے آیا تاکہ دلوں پر خوف کے تازیانے لگائے۔ بشیراً ونذیراً۔

میرے بھائیو اور بہنو! ایمان اور جہاد کے درمیان دعوت ربط قائم کرتی ہے۔ دعوت کے ذریعے ہی وہ جماعت وجود میں آ سکتی ہے جو جہاد کرے۔ دعوت کے ذریعے ہی وہ جماعت ایسی قوت بن سکتی ہے جو دوسری قوتوں پر غالب آ جائے۔ دعوت کے ذریعے ہی وہ حرارت پیدا ہو سکتی ہے جو دلوں کو گرما دے۔ دعوت کے ذریعے ہی انسان بدل سکتے ہیں' کھڑے ہو سکتے ہیں' اور متحرک ہو سکتے ہیں۔ اور اس طرح متحرک

ہو سکتے ہیں کہ اللہ کے دین کو غالب کر دیں۔ انسان ایمان سے سرشار ہو کر اور جہاد کر کے اللہ کے دین کو غالب کر دیں' اس کے علاوہ دین کو غالب کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

اگر آپ اسلامی انقلاب کا عزم کر چکے ہیں اور اسلامی انقلاب کی منزل کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں' تو یہ خواب دعوت کے کام سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ جتنے لوگ آپ کے ساتھ آتے جائیں گے' آپ کا قافلہ بڑھتا جائے گا۔ اگر آج ۵۷ آدمی لاکھوں تک پہنچ چکے ہیں تو یہ کام دعوت ہی کے نتیجے میں ہوا ہے۔ سید مودودیؒ کے الفاظ میں' انقلاب کی منزل اس وقت آئے گی جب صرف ملک میں ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر کم سے کم اربوں انسان ہماری دعوت سے واقف ہوں گے' کروڑوں انسان ہماری دعوت کو حق مان لیں گے' لاکھوں انسان ہماری اخلاقی اور عملی تائید کے لیے تیار ہوں گے اور ایک کثیر تعداد ایسے سرفروشوں کی تیار ہو جائے گی جو ہر خطرہ' ہر نقصان اور ہر مصیبت برداشت کرنے اور اپنی جان و مال لٹانے کے لیے تیار ہو گی۔ اس حالت تک پہنچنے سے پہلے اگر ہم آرزو کریں اور یہ خواب دیکھیں کہ اللہ کا دین غالب آ جائے گا' تو یہ خواب پورا نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے ہمیں جس بات کی جواب دہی کرنا ہو گی' جس بات کے لیے وہ ہمیں ذمہ دار ٹھہرائے گا' وہ سب سے بڑھ کر دعوت کی ذمہ داری ہے۔ وہ آپ سے اس بات کے لیے جواب طلب نہیں کرے گا کہ آپ نے شریعت کیوں نہیں نافذ کر دی' وہ آپ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تم اس بات میں کیوں کامیاب نہیں ہوئے کہ اسلامی نظام قائم کر دیتے' لیکن وہ آپ سے یہ بات ضرور پوچھے گا کہ تمھارے پاس جو حق تھا' تمھارے پاس جو شہادت تھی' تمھارے پاس جو کلمہ تھا' اسے تم نے اپنے گھر میں' اپنے محلے میں' اپنے گاؤں میں' اپنے ملک میں' کہاں تک پہنچایا۔ آج بھی اس ملک میں' کروڑوں کی آبادی کے ملک میں' کروڑوں مردوں اور کروڑوں عورتوں کے درمیان' کتنے ہیں جو آپ کی دعوت سے ناواقف ہیں' کتنے ہیں جنھوں نے آپ کا نام بھی نہیں سنا ہے!

اگر اس ملک میں انقلاب آنا ہے تو اسی صورت میں آ سکتا ہے کہ عام آدمی آپ کی دعوت کے لیے کھڑا ہو جائے' آبادی کا ایک بڑا حصہ آپ کے ساتھ آ جائے۔

اس مقام تک پہنچنے کے لیے آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنا ہو گی۔ جو آتا تھا وہ آپؐ کا دروازہ اپنے لیے کھلا پاتا تھا' آپؐ کی رحمت کی آغوش ہر ایک کو سمیٹ لیتی تھی۔ کمزور بھی آتے تھے' کچے پکے بھی آتے تھے' گناہ گار بھی آتے تھے۔ جو ایمان میں کمزور ہوتے تھے وہ بھی آتے تھے' جن کے اعمال ناقص ہوتے تھے وہ بھی آتے تھے' جن کی صلاحیتیں کم ہوتیں وہ بھی آتے تھے' جاہل بھی آتے تھے' بدو بھی آتے تھے' لیکن آپؐ نے ان سب کو جمع کیا' ایک قوت بنائی' جہاد کی راہ پر کھڑا کر دیا' اور

اسی طرح آخر کار اسلامی انقلاب رونما ہوا۔

میرے بھائیو اور بہنو! دراصل انقلاب لانے کے لیے اس انقلابی کردار کی ضرورت ہے جو ایمان جہاد اور دعوت سے بنتا ہے۔ ایمان' جہاد اور دعوت سے اس کردار کی بنیاد پڑے' اس کا نقشہ بنے' اس کی عمارت اٹھے' اس کی زینت کا سامان ہو' اس میں رنگ آئے۔ ایک دفعہ اگر آپ نے اس بات کو سمجھ لیا' اپنے ایمان کو مضبوط کیا' ایسا ایمان جس میں آپ کا رخ صرف اللہ کی طرف ہو گیا' آپ کو اللہ سب سے زیادہ پیارا ہو گیا' سب سے بڑھ کر آپ نے اس سے محبت کی' سب سے بڑھ کر آپ نے اس پر بھروسا کیا' اسی سے امیدیں باندھیں' اسی سے ڈرے' اسی کے اجر کے طالب رہے' ساری قوتیں' ساری صلاحیتیں اسی کی راہ میں لگائیں' تو پھر آپ دیکھیں گے کہ اللہ کا وعدہ آپ کے ساتھ پورا ہو گا کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (ال عمرٰن ۳:۱۳۹)' "تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو"۔ یعنی اگر تمھارے پاس ایمان ہو گا' ایمانی کردار ہو گا' تو تم زمین میں غالب ہو گے۔ اللہ کا یہ وعدہ بھی پورا ہو گا کہ اگر تم نے میری بندگی اس طرح کی کہ اس میں کوئی شریک نہ ہو تو میں زمین کی خلافت تمھیں عطا کروں گا۔

زمین کی خلافت بھی آپ کی منتظر ہے' زمین میں غلبہ بھی آپ کا منتظر ہے۔ لیکن یہ منتظر ہے اس کردار کا جو ایمان' جہاد اور دعوت سے آراستہ ہو اور ان ہی ہتھیاروں کو لے کر آگے بڑھے۔

میرے بھائیو اور بہنو! آج اس عظیم اجتماع عام کے آغاز میں اسی ایمان کی بات دل کے اندر تازہ کرنے کی ضرورت ہے' اسی جہاد کے جذبے کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے' اور اسی لیے بالکل آغاز میں' میں نے یہ چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ میرے اور آپ کے دونوں کے لیے نافع کرے۔

(اجتماع عام ۱۹۸۹ سے خطاب)

(اس کے ری پرنٹ 'منشورات' منصورہ' لاہور سے ۲۵۰ روپے سیکڑہ دستیاب ہیں)

اجتماع عام ۱۹۹۸ء

فیصل مسجد، اسلام آباد

دارالاسلام ٹرسٹ

جوہر آباد (خوشاب)

کے زیر اہتمام

اقامتی درس گاہ کا قیام

سید مودودیؒ کے پیش کردہ رہنما اصولوں کے عین مطابق

پہلے سے قائم سکول اب اقامتی درس گاہ میں تبدیل

جماعت سوم میں پڑھنے والے طالب علم کو تحریری اور زبانی امتحان کے بعد داخلہ دیا جائے گا۔

داخلے کا شیڈول

- داخلہ فارم ______ جنوری ۱۹۹۹ء
- امتحان، تحریری، زبانی ______ فروری ۱۹۹۹ء
- حتمی فیصلہ ______ مارچ ۱۹۹۹ء
- آغاز تعلیم ______ اپریل ۱۹۹۹ء

مزید معلومات کے لیے:

پروفیسر عطاء اللہ چودھری، ڈائریکٹر دارالاسلام ٹرسٹ

جوہر آباد (خوشاب) پاکستان۔ فون نمبر 2629 -0454

اسلامی تحریکیں ---- خدشات اور امکانات

قاضی حسین احمد

کیا دنیا کے مختلف حصوں میں اٹھنے والی اسلامی تحریکیں کسی خطرے کی علامت ہیں؟ وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بنا پر یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ ان تحریکوں کو کچل دیا جائے؟ کیا ان تحریکوں سے صرف غیر مسلم مغرب ہی خائف ہے یا مشرق کو بھی ان سے کوئی خطرہ درپیش ہے؟

یہ سوالات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن ان کا کوئی بھی جواب دینے سے پہلے میں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ "اسلامی تحریک" سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس نکتے کی وضاحت سے اس بے بنیاد خوف کی اصلیت بھی واضح ہو جائے گی جو مغرب اسلام سے خوامخواہ ہی محسوس کر رہا ہے۔

تحریک اسلامی کی بنیاد قرآن اور اللہ کے آخری رسول' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ عملی نمونہ زندگی پر قائم ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس کائنات کی بنیاد عدل و قسط کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ کائنات کامل ہے' ہر قسم کے نقص سے پاک ہے' اس کے اجزا میں ہم آہنگی ہے اور اس کا ہر عنصر کسی دوسرے عنصر کی تکمیل کرتا ہے۔ اسی وجہ سے نہ صرف یہ کہ زندگی قائم رہتی ہے بلکہ ہر لمحے ترقی کی طرف مائل ہے۔

اس بنیادی اصول کے حوالے سے ایک اسلامی تحریک کا مقصد عدل و قسط کا حصول اور معاشرتی و اخلاقی طور پر انصاف کا قیام ہے۔ انصاف کے قائم ہونے یا نہ ہونے کا ہماری زندگی سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ انصاف کے قیام کا منطقی نتیجہ امن' سکون اور احساس تحفظ ہوتا ہے جبکہ اس کے نہ ہونے کی صورت میں انسانی معاشرہ افراتفری' تصادم اور قتل و غارت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسلامی نظام عدل اگر مسلمانوں کے لیے ہے تو بقیہ دنیا کے لیے بھی ہے' بالفاظ دیگر اسلامی تحریک اپنے شانوں پر دو چہرے سجائے نہیں پھرتی' اس کے دو مختلف لائحہ عمل نہیں کہ مسلمانوں کے لیے تو وہ عدل و انصاف کے لیے کوشاں ہو اور غیر مسلموں کے لیے انتشار اور افراتفری کو روا رکھے۔ اسلامی تحریک تو ہر ایک کے لیے انصاف کی خواہاں ہے تاکہ یہ کرہ ارض

ایک بہتر زندگی گزارنے کے لیے مناسب مقام بن سکے۔ اہل مغرب صرف اپنے لیے امن و امان چاہتے ہیں جبکہ دوسروں کے لیے دائمی انتشار چاہتے ہیں۔

اسلامی تحریک اخلاقی ضوابط کی پابند ہوتی ہے۔ وہ افراد کو بیرونی ضابطوں اور ریاستی جبر سے خیر کی طرف راغب نہیں کرتی بلکہ انسان کے اندر نیکی کی جو صلاحیت ہے اسے نشوونما دے کر فرد کو اس سطح پر لے آتی ہے کہ وہ کسی خارجی محرک کے بغیر خود اپنا احتساب کرے اور اس طرح کے دوسرے افراد کے ساتھ مل کر ایسا معاشرہ بنائے جس میں خیرو فلاح کا دور دورہ ہو۔ حد سے زیادہ قانونی ضابطے' غیر ضروری حکومتی ادارے اور بے تحاشہ ریاستی اخراجات لادین سیکولر معاشروں کا خاصہ ہیں' اسلام ان سے اجتناب کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک فرد اپنے باطن کی خود اصلاح نہیں کرتا اس وقت تک نہ تو خوف سے آزاد ہو سکتا ہے اور نہ ہی ارادہ و اختیار کی آزادی کی اس راہ پر چل سکتا ہے جو اس کی پیدائش کی ایک غایت ہے۔ وہ اپنی شخصیت کے ان امکانات کی تکمیل بھی نہیں کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے ودیعت کیے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے اسلامی تحریک یہ ضروری سمجھتی ہے کہ بے حس اور بے محابہ مادیت' جنسی بے راہ روی اور اشیاے تعیش کی بے قید خواہشات کو اعتدال میں لایا جائے کیونکہ یہ تینوں موجودہ زمانے میں جرائم' عدم تحفظ اور خوف کا باعث ہیں۔ مغرب اپنی فطرت کے ان اجزاے ترکیبی کو نہ صرف برقرار رکھنا چاہتا ہے بلکہ انھیں دوسروں پر مسلط بھی کرنا چاہتا ہے۔

اسلامی تحریک عقل و دانش کی اہمیت میں یقین رکھتی ہے لیکن یہ یقین آزاد عقلیت پرستی پر منتج نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے اسلام کے اساسی اصولوں پر استوار کرنا چاہتی ہے۔ ہم زندگی کے ہر طرح کے معاملات میں وحی الٰہی کے اہم ترین کردار پر زور دیتے ہیں کیونکہ ایک حقیقی مابعد الطبیعیاتی بنیاد کی عدم موجودگی میں عقل ہدایت کا راستہ نہیں دکھاتی بلکہ ہولناک نتائج تک پہنچاتی ہے۔ اس کے برعکس مغرب عقل کو عقائد' تاریخ اور سماجی قدروں سے بالا رکھنا چاہتا ہے۔

اسلامی تحریک اس امر میں بھی یقین رکھتی ہے کہ انسانی کردار کے دو پہلو ہیں' یعنی اس کی فطرت روح اور مادہ سے عبارت ہے اور اس کے ارتقا اور تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اسے ایک مربوط اور جامع ترقیاتی ماڈل فراہم کیا جائے۔

ایسا نظام جو روحانی ضروریات کو نظرانداز کرے اور مادی ضروریات کو ہی ساری اہمیت دے وہ یک طرفہ ہے اور آخرکار ناکام ہو گا۔ یہ اصول ان مذاہب پر بھی صادق آتا ہے جو مادی تقاضوں کی قیمت پر روحانی قوت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اہل مغرب بالعموم انسانی فطرت کے روحانی پہلو کو اہمیت نہیں دیتے' اور سیکولر ازم کو ہی واحد طرز زندگی قرار دیتے ہیں۔

ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اسلام ایک طرز حیات ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے اپنا زاویہ فکر رکھتا ہے۔ مغرب اور ان کی فکر سے متاثر ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس کی تعبیریوں کرتا ہے کہ اسلام ایک "محدود مذہب" ہے' یہ ایک استبدادی حکومت بناتا ہے جو لوگوں پر ایک خاص قسم کا ریاستی فکر مسلط کر دے گا اور دوسری تعبیرات یا ذہنی رویے اختیار نہیں کیے جا سکیں گے۔ یہ بالکل غلط بات ہے' کیونکہ اسلام نہ تو "محدود مذہب" ہے' نہ ہی ایک جبری نظام ہے جو حکمت اور صبر سے عاری ہو۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ ایک نظریہ حیات ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ بنیادی تصورات دیتا ہے اور دنیا کے ہر کلچر کے لوگ ان اصولوں سے مطابقت رکھنے والے امور کو اختیار کر کے زندگی گزار سکتے ہیں۔ ایسا کوئی تاثر کہ اسلام ایک کلیت پرست ریاست بناتا ہے جو چھوٹی چھوٹی جزئیات تک اپنے شہریوں کے لیے طے کرے' بے بنیاد ہے۔ میں اسے ایک ناروا پابندی سمجھتا ہوں کہ لوگوں کے جمالیاتی ذوق اور ان کی اس فطری طلب میں کہ وہ جس شے کو اپنے لیے بہتر سمجھیں اس کا انتخاب کریں' مداخلت کی جائے۔ اسلام جبر کے خلاف ہے۔ ہم محض قانون کو ہی تبدیلی کا ذریعہ نہیں سمجھتے۔ ہم اخلاقی اقدار اور انسانی ضمیر کو معاشرتی تبدیلی کا اہم ترین ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں پاپائیت نہیں۔ ہم اختلاف رائے کو رحمت سمجھتے ہیں اور ہر ایک کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اسلام کی واضح حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی فکر کے مطابق جو درست سمجھے' اسے اختیار کرے۔

اسلامی حکومت کوئی بلڈوزر قسم کی شے نہیں جو ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دے اور انسانوں کے جسم اور روح پر ایک فولادی جیکٹ چڑھا دے۔ اسلامی حکومت تو اختلاف اور تنوع کو تسلیم کرتے ہوئے عوام الناس کو متحرک کرتی ہے کہ سب ہم نوا ہو کر ایک خوب صورت نغمے کی شکل اختیار کر لیں۔ اسلام جیسا کہ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے' لوگوں کو رواج اور رسومات کے غیر ضروری بوجھ سے آزادی دلاتا ہے' ان کی زنجیروں کو کاٹتا ہے اور انھیں جہالت اور جامد ذہنی رویوں سے نجات دلاتا ہے تاکہ وہ اپنا حق زندگی اسلام کے اندر رہتے ہوئے استعمال کر سکیں اور اس طرح اپنے حالات اور ماحول پر غالب ہو سکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دین کے متعلق فرمایا کہ یہ دین فطرت ہے۔ ہمارا بھی یہی تصور دین ہے۔ اسلام کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں' اس لیے قرآن نے بار بار تدبر و تفکر اور تعقل کی تلقین کی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ اسلام دشمن قوتیں اسلامی تحریک سے کیوں خائف ہیں۔ اس کی وجوہات بڑی نمایاں اور عام فہم ہیں۔

اسلامی تحریک مغرب کے سیکولر ماڈل کو مسترد کرتی ہے جو فرانسس فوکویاما (Francis Fukuyama) کے الفاظ میں "انسانیت کے نظریاتی ارتقا کی معراج ہے اور مغربی لبرل جمہوریت کی عالمی حقیقت کی صورت

میں انسانوں کی تشکیل کردہ حکومت کی کامل شکل ہے"۔

● اسلامی تحریک کا مغربی نظام قبول کرنے سے انکار ایک اختلاف رائے کا عام سا مسئلہ نہیں ہے' بلکہ اس طرح ہم اپنے انسانی جوہر کا اثبات کرتے ہیں۔ ہم اپنی تقدیر کے خود مالک بننا چاہتے ہیں۔ ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا مغرب کا کہ ہم اپنے لیے جس راہ کا چاہیں' انتخاب کریں۔ مسلمان نہیں چاہتے کہ ان کی تحقیر کی جائے اور ہر بات پر انھیں ذلت برداشت کرنی پڑے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے قوانین اور اداروں کے ذریعے خود حکومت کریں۔ اسلامی تحریک کی یہ خواہش کہ مسلمان اپنی تقدیر کے خود مالک بنیں' مغرب کے نزدیک ان کی تہذیب کے لیے حقیقی خطرہ ہے' جو ان کے عالمی غلبے اور تسلط کا خواب پریشان کر سکتی ہے۔ طاقت اور غلبے کی نفسیات میں یہ بات شامل ہے کہ اگر انحراف اور بغاوت کے اظہار پر سزا و تعزیر نہ دی جائے اور مخالف تہذیبی فکر کا راستہ نہ روکا جائے تو اس سے غالب تہذیب کی بقا کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ان کے اختتام کی ابتدا بن جائے۔

● اسلامی تحریک خود انحصاری پر یقین رکھتی ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بابرکت ذات کی پرستش کرنے والے دنیا میں مانگنے کے لیے نہیں بلکہ دینے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں اپنی کارکردگی' مہارت اور انتظامی صلاحیتوں میں بہترین ہونا چاہیے تاکہ وہ اسلامی نظام کی برتری دنیا پر ثابت کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہماری حق تلفی نہ ہو اور دنیا ہم سے انصاف کرے۔ اصولی طور پر تو مغرب کو مسلمانوں کی محض اس خواہش سے کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ اسلامی تحریک کا یہ اصرار کہ مسلمانان عالم کو آبرو مندانہ زندگی کا موقع ملے' مغرب کے لیے بنیادی مسئلہ بن گیا ہے۔

دراصل مغربی ممالک دولت کو طاقت' تحفظ اور خوشی کا منبع سمجھتے ہیں۔ دولت کے حصول کے لیے سستا خام مال اور اس کے بعد تیار شدہ اشیا کی کھپت کے لیے مارکیٹ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ اس وقت کل دنیا کی آبادی کا ۵.۶ فی صد ہے جبکہ دنیا کے بنیادی وسائل کا ۴۰ فی صد امریکی عوام خرچ کرتے ہیں اور اگر وسائل کے اس انتہائی تصرف و استحصال میں دوسرے مغربی ممالک اور روس کو بھی شامل کر لیا جائے تو باقی تمام دنیا کے لیے محض ۱۵ سے ۲۰ فی صد تک بچتا ہے۔ عالمی وسائل کے اس طرح کے بے جا استعمال نے مغرب میں ایک خطرناک "بیمار ذہن" پیدا کر دیا ہے جو برطانوی کردار پر جارج برنارڈ شا کے تبصرے میں خوب اچھی طرح بیان ہوا ہے:

ایک انگریز غلط یا صحیح کوئی بھی کام کرے لیکن وہ کبھی غلطی پر نہیں ہوتا۔ وہ (انگریز) آپ سے حب الوطنی کے اصولوں پر جنگ کرتا ہے' کاروبار کے اصولوں پر آپ کو لوٹتا ہے اور سامراجیت کے

اصولوں پر آپ کو غلام بنالیتا ہے۔

مندرجہ بالا رائے نہ صرف انگریز بلکہ تمام مغربی دنیا پر بالعموم صادق آتی ہے۔ مورخ پال جانسن (Paul Johnson) مغرب کے اسی رویے کو طاقت اور غلبے کی ایک زبردست خواہش قرار دیتے ہیں۔ ان کے بقول یہ ذہنی کیفیت ایک لادینی نظام میں تباہ کن صورت اختیار کر جاتی ہے۔ امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم اس وقت گرایا جب جنگ کے شعلے تقریباً سرد پڑ چکے تھے۔ اس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہ تھا کہ وہ جاپان کو مثالی سزا دے کر پوری دنیا پر اپنی دھاک بٹھا دے۔ اسی روش کو جاری رکھتے ہوئے امریکہ نے ابھی تک عراق کا گھیراؤ کیا ہوا ہے اور بتدریج اس کو مکمل تباہی کی طرف دھکیل رہا ہے' جبکہ عراق کویت جنگ کبھی کی ختم ہو چکی ہے۔

اسلام کے خلاف سازشیں

مغرب کے خوف کی یہ نوعیت اور دوسروں کی دولت اور وسائل کی بنیاد پر اپنی جھوٹی خوش حالی کو قائم رکھنے کی یہ شدید خواہش' اسے مسلمانوں کے اور ان کی حقیقی قیادت کے بارے میں مختلف قسم کی ریشہ دوانیوں میں مصروف رکھتی ہے:

اول' مغرب کی اسلامی تہذیب و ثقافت کے خلاف مسلسل یورش کہ یہ ایک "فرسودہ" اور "ازمنہ قدیم" نظریہ حیات ہے جو مخصوص سماجی و معاشی حالات اور تاریخ کے ایک خاص دور کی پیداوار ہے۔

دوم' ٹیلی وژن پروگرام' کتابوں' رسائل اور اخبارات کی مدد سے ایک اطلاعاتی ماحول کے ذریعے سیکولر ذہن بنانا' جو مغرب کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہو۔

سوم' ایک ایسے تعلیم یافتہ گروہ کی تشکیل جو مغرب کو اپنے لیے ماڈل سمجھے اور اس طرح خود اپنے معاشرے اور اس کی اخلاقی قدروں کے خلاف صف آرا ہو جائے۔

چہارم' قدروں سے آزاد ایک ایسے لبرل تعلیمی نظام کی تشکیل کی حوصلہ افزائی' جس کے نتیجے میں مسلمان معاشرے کو مغرب میں ضم کیا جاسکے۔

پنجم' مسلمان معاشروں میں کٹھ پتلی حکومتوں کی تشکیل جن کے ذریعے اسلامی تحریکوں کا سدباب بھی کیا جائے اور ساتھ ہی مسلم عوام کو غربت و افلاس میں ہمیشہ کے لیے مبتلا رکھا جاسکے۔ آخر الذکر مقصد کے حصول کے لیے مغرب عالمی بنک اور آئی ایم ایف کو استعمال کرتا ہے۔ پروفیسر چامسکئی (Chomsky) جو خود امریکی شہری ہیں' اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ "آئی ایم ایف کی شرائط جو آزاد مارکیٹ معیشت کا مطالبہ کرتی ہیں خوراک پر زر تلافی (سبسڈی) اور مقامی صنعتوں کے تحفظ کی مخالفت کرتی ہیں۔ یہ طریقہ کار اس امر کا ضامن ہے کہ اہل ثروت اور مراعات یافتہ افراد ہی اس (جمہوری) تماشے کو چلائیں اور دو سطحی

معاشروں کو برقرار رکھیں جو (مغرب کے لیے) از بس ضروری ہے"۔ ایک اور تدبیر جسے اہل مغرب نے تجربات کے بعد سائنس کی شکل دی ہے وہ قرضہ جات کی فراہمی اور مقامی کرنسیوں کا اس طرح سے انتظام و انصرام ہے کہ ڈالر کے لیے مصنوعی قلت پیدا کی جاسکے۔ مثلاً ۱۳۰ ارب ڈالر کا ایک آزاد متحرک فنڈ تشکیل دیا گیا ہے جو کسی ملک تک محدود نہیں۔ اس فنڈ کو جوئے کی رقم (casino money) کہا جاتا ہے۔ اس کے توسط سے سٹاک مارکیٹوں میں سرمایہ کاری کر کے سٹاک کی قیمتوں میں مصنوعی تیزی پیدا کی جاتی ہے اور اس طرح سے مارکیٹ میں ابال لا کر سرمایے کو نکال لیا جاتا ہے۔

ششم، جہاں تعذیب و تعزیر اسلامی تحریک کو روک نہ سکے، وہاں یہ کوشش کی جائے کہ ان کی قیادت کے خلاف گندگی اچھالنے کی مہم کو تسلسل سے جاری رکھا جائے جس کے نتیجے میں اسے "نااہل"، "متروک"، "بے مغز عقیدہ پرست"، "رجعت پسند" اور "تاریک خیال" ثابت کیا جاسکے۔

اس مسلسل کش مکش میں مغرب کے آلہ کار حکمران اور سیکولر حضرات کا اسلامی قوتوں کے خلاف ایک فطری الحاق بنتا ہے۔ ماضی میں الجزائر اور دیگر ممالک میں اسلامی تحریک کے ظہور و عروج کے پس منظر میں ایک نئی حکمت عملی وضع کی جارہی ہے جس کے خدوخال درج ذیل ہیں:

- اسلامی تحریکوں کے خلاف کھلم کھلا جارحیت کا ارتکاب نہ کیا جائے کیونکہ اس پر ردعمل سے ان کی اپیل میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔
- اسلام کو نمایشی سطح پر اختیار کر لیا جائے۔ کٹھ پتلی حکومتیں عبادات اور رسومات پر زور دیں۔ یہ سب کچھ ٹیلی ویژن کی روشنی میں کیا جاتا ہے تاکہ حکمرانوں کی اسلام دوستی کا تاثر مسلم عوام کو دیا جاسکے۔ ساتھ ہی ٹی وی پر "بے روح" مذہبی پروگرام تسلسل سے پیش کیے جائیں۔
- مسلمان عوام کی اسلام سے محبت کو کم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسلامی قوتوں کو حکومت میں شامل کیا جائے اور یہ اہتمام کیا جائے کہ وہ مروجہ نظام کے اندر رہ کر کام کریں۔ اس طرح عوام میں ان کی نااہلیت ثابت کی جاسکے گی۔ مزید برآں مروجہ نظام میں کام کرتے ہوئے ان کے اعلیٰ اصول، عملی تقاضوں کی تاب نہ لا کر، اپنی کشش کھو دیں گے۔
- جب وہ ایک دفعہ مروجہ نظام کا حصہ بن جائیں گے، تو پھر ان کی منفرد حیثیت باقی نہ رہے گی بلکہ دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح کی کمزوریاں بلکہ انھی کی مالی بدمعاملگی اور کرپشن بھی ان میں در آئیں گی۔
- مغرب اپنی ایجنٹ حکومت کے لیے یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ اپنے عوام کو اچھی اور ذمہ دار حکومت دیں تاکہ ملک میں ایسے حالات نہ رہیں جو اسلامی تحریکوں کے برگ و بار لانے کے لیے سازگار ہوں۔

مغرب اور ان کے گماشتوں کی ان سازشوں کے باوجود اسلامی تحریک اپنے آپ کو عوام سے وابستہ کرتے ہوئے اسلامی تبدیلی کے عمل کو تیز تر کرے گی۔ یہ ہمارا اپنے رب سے، اپنے عوام سے اور اپنی تاریخ سے وعدہ ہے۔ سیکولر حضرات ہماری تاریخ کی مذمت کرتے ہیں لیکن اسی تاریخ سے ہماری ملی زندگی کا اثبات ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ دوسرے تو تاریخ کو پارینہ واقعات کا مجموعہ تصور کرتے ہیں لیکن مسلمانوں کے لیے تو یہ میزان عمل اور تعزیر ہے۔ یہ نہ صرف ہماری ماضی کی کامرانیوں کی عکاسی کرتی ہے بلکہ ہمیں اپنے حال کی ناکامیاں بھی دکھاتی ہے۔ اسلامی ریاست کی عدم موجودگی میں ایک مسلمان کی زندگی کرب انگیز ہوتی ہے۔ اس کا احساس ذلت شدید اور اس کی روح کا زخم گہرا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نوجوان نسل صورت حال کی سنگینی کو انگیز کرتے ہوئے خلافت کے احیا کے لیے سرفروشی کا مظاہرہ کرتی رہے گی، ایک ایسی جدید ریاست کے قیام کے لیے جو نہ تو اپنے ماضی پر شرمندہ ہوگی اور نہ ہم عصر تقاضوں سے گریز کی راہ اختیار کرے گی۔ وہ امن و سلامتی، عزت و سربلندی اور کامیابی و خوش حالی کی نقیب ہوگی۔

رسائل و مسائل

شادی کے باوجود علیحدہ رہنا

سوال: میرا مسئلہ وہی ہے جس سے ہمارا معاشرہ خاصے بڑے پیمانے پر دوچار ہے۔ ہمارے ملک کے بہت سے افراد روزگار یا تعلیم کے سلسلے میں باہر ہیں۔ بعض صورتوں میں شوہر اور بیوی طویل مدت کے لیے علیحدہ رہنے پر مجبور ہیں۔ میرے شوہر کو پاکستان سے امریکہ گئے ہوئے چھٹا سال ہے۔ وہ وہاں پڑھ رہے تھے۔ اس عرصے میں انھوں نے پاکستان آکر نکاح کیا اور ڈھائی سال بعد واپس آئے اور رخصتی ہوئی اور ایک ڈیڑھ مہینہ میرے ساتھ رہے۔ پھر واپس امریکہ چلے گئے اور مجھے اپنے بھائی بھاوج کے گھر چھوڑ گئے۔

(خاتون کے تفصیلی خط سے' درج ذیل سوالات مرتب کیے گئے:)

۱۔ کیا ایک شادی شدہ لڑکی کو اس کا شوہر ایسے جیٹھ کے گھر میں جس کے بچے بھی جوان ہوں' اس کی مرضی کے خلاف چھوڑ کر ۴'۶ سال تک ملک سے باہر رہ سکتا ہے؟

۲۔ کیا شوہر کا اپنے مستقبل کے منصوبوں کے پیش نظر ۴'۶ سال تک بیوی کو اپنے سے دور پاکستان میں چھوڑنا درست ہے؟

۳۔ اگر اس طرح دوری کی شکل میں شوہر اپنی جنسی ضرورت' کسی فقہی رائے کے پیش نظر "استمنا بالید" سے پوری کر لیتا ہے جبکہ پاکستان میں بیوی جدائی کے دن گزار رہی ہو تو کیا ایسا کرنا درست ہے؟

۴۔ ایسی بے کس خواتین کس طرح اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود پر قائم رہیں اور شوہر کی عدم موجودگی میں کیسے اپنی حفاظت کریں؟

۵۔ اگر سسرال والوں کی نگاہ میں لڑکی کا اس طرح ان کے ساتھ رہنا ایک فطری اور درست کام ہو تو ان کے ساتھ کیا رویہ رکھا جائے اور ان کے ناروا سلوک کا کیا جواب دیا جائے؟

جواب: آپ نے جن معاشرتی مسائل کی طرف متوجہ کیا ہے وہ اجتماعی اہمیت کے حامل ہیں اور خصوصاً ان حضرات کے لیے ان پر غور کرنا بہت ضروری ہے جو تعمیر سیرت کے ذریعے خاندان' معاشرہ اور ریاست کے اداروں کو تبدیل کر کے ایک صالح قیادت اور ذمہ دار امامت کے لیے کوشاں ہیں۔ اسلام کے نظام حیات کے قیام و نفاذ کے لیے خاندان کی اصلاح بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی لیے قرآن عظیم کا فرمان ہے: قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (التحریم ۶۶:۶)' "بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے"۔ اور یہ واضح حکم دیا گیا ہے: وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ (النور ۲۴:۳۲)' "تم میں سے جو غیر شادی شدہ ہوں ان کا نکاح کر دو"۔ نکاح کو اسلام نے ایسے حصار سے تعبیر کیا ہے جو ایک فرد کو نہیں' بلکہ ایک پورے خاندان کو فواحش اور فتنے سے نکال کر معروف' بر' حیا اور تقویٰ کے ماحول میں لے آتا ہے۔

آپ سوالات کے متعین جوابات سے قبل تفہیم مسئلہ کی غرض سے چند نکات پر غور کر لیجیے اور مناسب ہو تو ان نکات کو اپنے شوہر اور سسرال والوں کے علم میں بھی لے آیئے:

نکاح کی زندگی کو قرآن و حدیث نے تقویٰ' ایمان اور معروف سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم سورۃ النساء کی پہلی آیت میں فرماتا ہے: "لوگو' اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو' اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو"۔ سورۃ النور میں فرمایا گیا: "تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمھارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں' ان کے نکاح کر دو۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا" (۲۴:۳۲)۔ گویا انسان کے مقصد وجود میں یہ بات شامل ہے کہ وہ رشتہ زوج کو اختیار کرے اور آبادی میں اضافہ بھی کرے۔

جس کے پاس وسائل نہ ہوں' اس کے لیے معاشرہ اور ریاست دونوں کی ذمہ داری کا تعین کر دیا گیا کہ وہ اپنے مجرد افراد' خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام' ان کے عفت و عصمت کے ساتھ رہنے کا بندوبست کرے۔ اسی بنا پر حدیث میں یہ بات فرمائی گئی کہ نکاح تکمیل ایمان کا ذریعہ ہے اور پھر وہ صداقت بیان کر دی گئی کہ جو نکاح سے بھاگتا ہے اور سنت رسولؐ کی پیروی کا منکر ہے وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے نہیں (اَلنِّکَاحُ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)۔ سورۃ الروم میں اس تعلق کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایک اور نشانی یا آیت سے تعبیر فرمایا گیا کہ "اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمھارے درمیان محبت و رحمت پیدا کر دی" (۳۰:۲۱)۔

ان مختلف قرآنی احکام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نکاح کا مقصد محض ایک قانونی کارروائی نہیں بلکہ ایک ساتھ رہنا' تقویٰ اور طہارت اختیار کرنا' ایک دوسرے کو سکون دینا' اولاد کی پیدائش اور رضاعت و تربیت کرنا ہے۔ ظاہر ہے یہ سب کام شوہر اور بیوی دور بیٹھ کر نہیں کر سکتے۔

قرآن کریم نے جن تمثیلات کے ذریعے سے اس رشتے کی اہمیت' مقام اور معاشرے کے صالح رکھنے میں اس کے کردار کا ذکر کیا ہے وہ بھی غیر معمولی طور پر توجہ طلب ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ میں شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کے لیے لباس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ "وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو" (۲: ۱۸۷)۔ اگر غور کیا جائے تو لباس جہاں ایک شخص کو موسمی اور فضا کے اثرات سے تحفظ فراہم کرتا ہے وہیں اس کی شخصیت کی تکمیل' اس کی زینت و جاذبیت میں اضافے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ اس تمثیل میں یہ بات بھی شامل کر دی گئی ہے کہ جس طرح لباس اور جسم کے درمیان کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی ایسے ہی شوہر اور بیوی کے درمیان دوری کی جگہ قربت' بے تکلفی اور یکجائی ضروری ہے۔ قرآن اس رشتے کو جگہ جگہ سکون سے تعبیر کرتا ہے۔ "وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے (الاعراف ۷: ۱۸۹)۔ یہاں بھی یہ بات ذہن نشین کرائی جا رہی ہے کہ ایک شوہر جھمیلوں سے تھکا ہارا جب گھر پہنچے تو زوجہ کو دیکھ کر اس کی تمام تھکن' اضمحلال اور نفسیاتی گراوٹ دور ہو جائے اور اسے جذباتی طور پر' جسمانی طور پر اور روحانی طور پر سکون و لذت مل سکے۔ ایک حدیث میں اس مضمون کو یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ سب سے بہتر بیوی وہ ہے جو اپنے شوہر کو خوش کرے جبکہ وہ اس کی طرف دیکھے' اطاعت کرے جب وہ اسے حکم دے۔

عقد نکاح کے مندرجہ بالا اور دیگر فوائد کے پیش نظر اسلام نے تجرد کی زندگی کو سخت ناپسند کیا ہے اور گرم جوش خاندانی زندگی کو مستحسن قرار دیا ہے۔ اس تعارف و تمہید کے بعد اب آپ کے سوالات کی طرف آتے ہیں۔

جہاں تک ایک شوہر کا اپنی منکوحہ کو نکاح کرنے کے بعد اپنے بھائی بھاوج کے پاس چھوڑ کر امریکہ یا گھر سے دور رہنے کا تعلق ہے' یہ شریعت کے نقطہ نظر سے نہ صرف وظائف شوہری سے انحراف ہے بلکہ خود اپنے آپ کو اور اپنی منکوحہ کو ایک بھاری امتحان میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ اولاً یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ایک جیٹھ یا اس کی جیٹھانی اپنی نوجوان دیورانی کو وہ معاشرتی اور جذباتی تحفظ دے سکے جو ایک منکوحہ کو اس کا شوہر فراہم کرتا ہے۔ پھر اگر جیٹھ کے بچے بھی نوجوان ہیں تو ایک منکوحہ لڑکی کا جیٹھ اور اس کے نوجوان لڑکوں کے ساتھ ایک گھر میں رہنا اسلام کے تصور معاشرت سے براہ راست ٹکراتا ہے۔ اس لیے اگر ایسی لڑکی اسلام کے نظام عفت و حجاب پر عامل ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک قید مسلسل میں محسوس کرے گی۔ پھر

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طویل عرصے میں جبکہ شوہر سے دور ہو' کیا وہ چار چھ سال تک نہ کبھی ہنسے' نہ خوشبو لگائے' نہ بناؤ سنگھار کرے' نہ اپنی مرضی سے کھائے پیئے' یا یہ سب کچھ کرے اور فتنے میں پڑے؟ اگر ایک شوہر کو ان مسائل کا احساس و ادراک نہ بھی ہو' وہ اپنی "معصومیت" میں یہ سمجھتا ہو کہ اس کی غیر موجودگی کی کسر اس کا بھائی یا بھاوج یا بھائی کی اولاد پوری کر سکتی ہے تو کم از کم اس کے بڑے بھائی' یا اگر والدین زندہ ہیں تو ان کا شرعی فریضہ ہے کہ وہ اسے اس ظلم سے باز رکھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ عمل مقصد نکاح کے منافی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ فقہی طور پر اس صورت حال میں اگر ایک مظلوم منکوحہ خلع کے لیے کہے تو وہ حق بجانب ہو گی (یاد رہے مباح اعمال میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ عمل طلاق ہے)۔

شوہر کا محض مستقبل کے مادی منصوبوں کی تکمیل کے لیے بیوی کو قید تنہائی میں مبتلا کر دینا' ایک انتہائی قابل اعتراض' خود غرضانہ طرز عمل ہے۔ اگر اس سارے معاملے کی بنیاد مالی استطاعت ہی ہے تو کیا اس مشکل کا علم اسے نکاح سے پہلے نہ تھا۔ اگر یہ صورت حال اس کے علم میں تھی تو پھر گواہوں کے سامنے اقرار اور نکاح کے بعد ذمہ داریوں سے فرار کوئی مناسب اخلاقی طرز عمل نہیں۔

یہاں ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔ نکاح اسلام کی نگاہ میں معاشرت کا حلال اور مطلوب طریقہ ہے جبکہ تجرد' جو خود عائد کردہ ہو' اپنے لیے ایک حلال چیز کو حرام کر دینے کے مترادف ہے اور وہ بھی یکطرفہ طور پر' اپنی منکوحہ کی رائے اور حق کو پامال کرتے ہوئے۔

نکاح کے بعد حقوق کی ادائیگی کے لیے اسلام کی تعلیمات بالکل واضح ہیں۔ **تفہیم القرآن** میں مفکر اسلام استاذی امام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں: "بعض روایات سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ ایک صحابیؓ کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ وہ ایک مدت سے اپنی بیوی کے پاس نہیں گئے ہیں اور شب و روز عبادت میں مشغول رہتے ہیں تو آپؐ نے بلا کر ان کو حکم دیا کہ ابھی اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ انھوں نے کہا کہ میں روزے سے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: روزہ توڑ دو اور جاؤ۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک خاتون نے شکایت پیش کی کہ میرے شوہر دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر عبادت کرتے ہیں اور مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ حضرت عمرؓ نے مشہور تابعی بزرگ' کعب بن سور الازدی کو ان کے مقدمے کی سماعت کے لیے مقرر کیا' اور انھوں نے فیصلہ دیا کہ اس خاتون کے شوہر کو تین راتوں کے لیے اختیار ہے کہ جتنی چاہیں عبادت کریں مگر چوتھی رات لازماً ان کی بیوی کا حق ہے" (**تفہیم القرآن**' ج ا' ص ۴۹۸-۴۹۹)۔

حدیث شریف کے اتنے واضح احکام کے بعد نہ نفس کشی کی' نہ بیوی سے کنارہ کشی کی کوئی گنجایش باقی رہتی ہے' اور نہ ایک نیک خاتون کو اذیت دینے کی۔ میرے علم میں تقویٰ' احسان اور طہارت نفس کے

حوالے سے کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ جس میں ایک شوہر اپنی پاک دامنی کے لیے شریعت کے فراہم کردہ مرغوب و مطلوب طریقے سے ہٹ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرے اور اپنی منکوحہ کو جان بوجھ کر آزمایش میں ڈالے۔ کیا وہ خاتون بھی اسی قسم کا کوئی حیلہ اپنی تسکین کے لیے اختیار کرے؟ اور اگر وہ ایسا کرے گی تو کیا شوہر کے خیال میں جس چیز کو اس نے اپنے لیے پسند کیا ہے، کیا وہ بیوی کے لیے بھی پسند کرے گا؟ ان معاشرتی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے ہمیں براہ راست اور کھل کر بات کرنی ہوگی اور مردوں اور خواتین دونوں کو دین کے قائم کردہ حقوق کی ادائیگی پر آمادہ کرنا ہوگا۔

آپ کے سوال میں مردوں کے جس غیر اسلامی رویے کی نشان دہی کی گئی ہے اسلام کا دعویٰ کرنے والے کسی شخص کے پاس اس کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ ایک شوہر کا بنیادی فرض اپنی منکوحہ کو تحفظ، عفت اور حجاب کے ساتھ رہایش اور نفقہ فراہم کرنا ہے۔ ایک نوجوان صالح لڑکی کا ان حالات میں عفت و تقویٰ کے ساتھ اپنے آپ کو فتنوں سے محفوظ رکھنا ایک عظیم جہاد ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہترین اجر کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اگر شوہر کو خود اپنی غلطی کا احساس نہ ہو تو اس کے اعزہ کا فرض ہے کہ اس پر جس حد تک ممکن ہو، دباؤ ڈال کر اسے اپنی منکوحہ کے حقوق کی ادائیگی پر آمادہ کریں۔

ایک لمحے کے لیے اگر یہ بات بطور مفروضہ کے مان بھی لی جائے کہ شوہر طالب علم ہونے کے سبب بیوی کے اخراجات امریکہ میں برداشت نہیں کر سکتا تو یہ بات نکاح سے قبل سوچنے کی تھی اور نکاح سے قبل لڑکی کے خاندان والوں پر واضح کر دینی چاہیے تھی کہ وہ لڑکی کو ۶ سال تک امریکہ نہیں بلا سکے گا۔ اس صورت میں اس عمل کے غیر اسلامی ہونے کے باوجود کم از کم لڑکی اور اس کے والدین ذہنی طور پر اس امتحان کے لیے آمادہ ہوتے۔ جو صورت حال آپ کے خط سے یکطرفہ طور پر سامنے آئی ہے، وہ لڑکی پر ایک ظلم کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں پہلے سوال کا جواب واضح طور پر نفی میں ہے یعنی شوہر کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دوسرے سوال کا جواب بھی پہلے جواب میں شامل ہے۔ یعنی وہ اپنے مادی مقاصد و اہداف کی تکمیل ضرور کرے لیکن اپنے حقوق و فرائض کی ادائیگی کے بعد۔ حقوق و فرائض کو نظرانداز کر کے محض اپنی ذاتی ترقی کی امید پر بیوی کو چھ سال تک چھوڑے رکھنا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔

"استمنا بالید" کو محض مجبوری کی شکل میں کم تر برائی کے طور پر ابن حزمؒ نے اس بنا پر حلال قرار دیا ہے کہ شریعت میں اس کی واضح ممانعت نہیں ہے۔ جو چیز حرام نہ کی گئی ہو وہ حلال تصور کی جائے گی۔ ان کا خیال ہے کہ حسن بصری، عمرو بن دینار اور مجاہد بھی اس کی اباحت کے قائل تھے اور عطا اس کو صرف مکروہ سمجھتے تھے۔ حنفی مسلک رد المختار میں اسے حرام اور مستلزم عذاب قرار دینے کے بعد صرف اس شکل

میں جائز کرتا ہے کہ جب ایسا نہ کرنا ایک شخص کو زنا پر مجبور کر دے۔ گویا حالت اضطرار میں اسے جائز قرار دیتا ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ سورہ المومنون کی آیت وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ (۲۳:۵-۷)، "اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک یمین میں ہوں کہ ان پر محفوظ نہ رکھنے میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں، وہی زیادتی کرنے والے ہیں" کو بنیاد بناتے ہوئے اسے قطعاً حرام قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اس آیت میں مرد اور عورت کے لیے شہوت کی تسکین کے صرف دو ذرائع کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ اس کی تائید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ہاتھ سے نکاح کرنے والے کو ملعون اور آخرت میں دوزخ میں داخل ہونے والا قرار دیا گیا ہے۔ عقلی طور پر بھی دیکھا جائے تو جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ ایک ایسے شخص کے لیے جو شادی شدہ بھی ہو، بیوی کو ہزارہا میل دور چھوڑ کر قضاء شہوت کے لیے وہ ذریعہ اختیار کرنا جسے ان آیات میں "عدوان" کہا گیا ہے، کسی طرح درست نہیں کہا جا سکتا۔

ایسی خاتون جو اپنے شوہر کی دین سے ناواقفیت کی بنا پر آزمایش کا شکار ہے، اسے بہرحال اپنی عفت و عصمت کی پوری حفاظت کرتے ہوئے روزہ، تلاوت قرآن اور نماز سے مدد لینی چاہیے۔ وہ فی الواقع ایسی حالت میں تقویٰ کے لحاظ سے اپنے شوہر سے کہیں زیادہ افضل مقام رکھتی ہے۔ یہی رویہ اسے اپنے سسرال والوں کے ساتھ رکھنا چاہیے، یعنی بھلائی اور احترام کے ساتھ پیش آنا۔

اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر کو توفیق دے کہ وہ نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں بلکہ وہ آپ کے حقوق کی ادائگی میں احسان کا رویہ اختیار کریں۔ (ڈاکٹر انیس احمد)

سب سے اچھی دعا

س: دعائیں تو ہم مانگتے رہتے ہیں۔ یہ بتایئے کہ اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ دعا کون سی ہے جو اس سے مانگی جائے۔ عام لوگ تو اپنے مطلب کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں؟

ج: عام لوگ ہوں یا خاص لوگ، سب ہی اللہ کے محتاج ہیں اور سب کا مقصود و مطلوب، آخرت کی سرخروئی و کامیابی، جنت کا حصول اور دنیا کی بھلائی اور کامیابی ہے۔ دنیا سے اللہ کے خاص بندے بھی صرف نظر نہیں کر سکتے۔ دنیا کی زندگی کو اللہ کے حکم کے مطابق گزارنا ہی دین ہے۔ خاص ہوں یا عام بہرحال ہر بندے کو اسی دنیا میں زندگی گزار کر آخرت کی سرخروئی حاصل کرنی ہے۔ اس لیے یہ دعا سکھائی گئی ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرہ ۲:۲۰۱)

اے ہمارے رب، ہمیں دنیا کی زندگی میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھلائی عطا فرما اور ہم کو آتش جہنم کے عذاب سے بچا۔

خدا کے مقبول بندے صرف یہی نہیں کہ آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا کی بھلائی کی بھی دعا کرتے ہیں، بلکہ دنیا کی بھلائی کا تذکرہ پہلے کرتے ہیں اور آخرت کی بھلائی کا تذکرہ بعد میں۔ اس لیے کہ واقعہ کے لحاظ سے بھی دنیا کی زندگی پہلے ہے، اس سے پہلے سابقہ پڑتا ہے اور آخرت کی زندگی بعد میں ہے، اس سے بعد میں سابقہ پڑے گا۔ اور اس لیے بھی کہ آخرت کو بنانے اور وہاں سرخروئی حاصل کرنے اور خدا کو راضی کرنے کا واحد ذریعہ بھی ہمارے پاس صرف یہی دنیا کی زندگی ہے جو پہلے ملی ہے، اسی کی بدولت ہم آخرت میں جنت حاصل کر سکیں گے۔ یہی ہماری واحد پونجی ہے۔ یہ اگر ہم نے ضائع کر دی تو پھر جنت حاصل کرنے اور خدا کی رضا پانے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اسی زندگی کو دیکھ کر حشر کا منصف ہمارے بارے میں جنت کا فیصلہ کرے گا یا جہنم کا، اس لیے بندہ دنیا کو اہمیت دیتا ہے۔ اپنی دعا میں پہلے اسی کا ذکر کرتا ہے، اور اس کی بھلائی کا طالب بھی ہوتا ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے کہ جو مومن مرد اور مومنہ عورت بھی نیک عمل کرے گی اور وہ صاحب ایمان بھی ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ حیات طیبہ عطا فرمائے گا۔ دنیا میں حیات طیبہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اسی لیے بندہ مومن اس کی دعا کرتا ہے۔ دراصل ہر بندہ عاجز و درماندہ ہے۔ اس زندگی میں بھی ایک ایک سانس کے لیے اللہ کا محتاج ہے اور اس زندگی میں بھی اللہ کی نظر عنایت نہ ہو تو وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ زندگی کے ہر ہر لمحے کے لیے وہ خدا کا محتاج ہے۔ اس عاجزی، بے بسی، بے مائیگی اور سراسر احتیاج کا حقیقی اور گہرا احساس ہی بندے کی اصل متاع ہے اور جن بندوں کا یہ احساس جس قدر گہرا ہے، وہی خوش نصیب، خدا کے خاص بندے ہیں۔ اسی شان بندگی پر خدا کو پیار آتا ہے، اسی احساس بندگی سے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی ہیں اور انھی دھڑکنوں کی ترجمان دعا ہے۔

دعا دراصل صرف ان الفاظ کو زبان سے ادا کر لینے کا نام نہیں ہے، جن کو دعا کے لیے ہم استعمال کرتے ہیں یا جو ہم نے دہرانے کے لیے رٹ لیے ہیں۔ دعا دل کی کیفیت، عجز و احتیاج اور دھڑکنوں کو زبان سے بیان کرنے کا نام ہے۔ وہ الفاظ جن میں عجز و احتیاج اور زندگی و بیچارگی کی چاشنی نہ ہو، وہ دعا نہیں ہے، دعا کا مظاہرہ ہے۔ دعا کے مظاہرے کی تخفیف ہرگز مقصود نہیں ہے، مگر حقیقت میں دعا وہی ہے جو اس گہرے احساس اور قلب کی اس کیفیت کے ساتھ مانگی جائے کہ بندہ واقعی، سراپا احتجاج و بے مایہ ہے اور دینے والی ذات صرف وہی ہے جس کے حضور ہاتھ پھیلا کر وہ بھیک مانگ رہا ہے۔ اس پہلو سے سوچیں تو نہ کوئی عام

ہے نہ خاص' ہر ایک محتاج و بے نوا ہے بلکہ اپنے تذلل اور احتیاج کا جس کو زیادہ احساس ہے' وہی خاص ہے۔

پھر یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ بندہ دونوں جہاں میں اپنے رب کی توجہ' عنایت' کرم اور مدد کا محتاج ہے۔ اس لیے ایسا سمجھنا کہ دنیا کے مقاصد کے لیے رب سے دعائیں مانگنا کچھ کم تر درجے کی بات ہے' صحیح نہیں ہے بلکہ دنیا کے لیے دعا نہ مانگنا کم تر درجے کی بات ہے۔ اپنے مقاصد کے لیے رب کے حضور گڑگڑانا اور مانگتے رہنا ہی بلندی کی بات ہے۔ اپنی ہر بشری اور دنیوی ضرورت اور اخروی کامیابی کے لیے برابر مانگنا اور اس کے آگے جھولی پھیلانا ہی شان بندگی ہے۔ اللہ کی رحمت اور فیضان کرم کے دروازے اسی خوش نصیب بندے کے لیے کھلتے ہیں جو اس کے حضور ہاتھ پھیلاتا ہے اور عجز و تذلل کے ساتھ دعا کی توفیق پاتا ہے۔

اللہ سے مانگنے کے لیے سب سے اچھی دعا کون سی ہے؟ اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے میں اللہ کے سچے رسولؐ کی زبان سے آپ کو بتاتا ہوں۔ اس میں یہ بات بھی ہے کہ سب سے اچھی دعا کیا ہے اور یہ بھی اسی میں مضمر ہے کہ دنیا کے لیے دعا کرنا بھی مطلوب و پسندیدہ ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے ایک روایت منقول ہے: قال قال رسول اللہ ﷺ من فتح لہ منکم باب الدعا فتحت لہ ابواب الرحمۃ وما سئل شیئاً یعنی احب الیہ من ان یسال العافیۃ (جامع ترمذی)' "حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا: "تم لوگوں میں سے جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھل گیا سمجھ لو کہ اس کے لیے رحمت و نوازش کے دروازے کھل گئے اور بندے کی دعاؤں میں سب سے اچھی دعا جو اللہ سے مانگی جائے وہ یہ ہے کہ اس سے عافیت کی دعا کی جائے"۔

"عافیت" بہت ہی جامع لفظ ہے۔ بلاشبہ اس لفظ میں آخرت کی عافیت' وہاں کی سلامتی' وہاں کے رنج و خوف سے حفاظت اور وہاں کی سرخروئی اور اطمینان و سکون بھی شامل ہے لیکن یہ لفظ زبان سے ادا کرتے ہوئے ذہن پہلے دنیا کی عافیت اور یہاں ہر طرح کے ظاہری اور باطنی آفات و مصائب سے حفاظت اور سلامتی و عافیت کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ بندہ عافیت کی دعا کر کے ہر طرح کے آلام و مصائب' امراض و پریشانی' ذہنی و جسمانی دکھ درد' معذوری و لاچاری' فقر و فاقہ' لوگوں کے ظلم و اذیت اور خدا کی ناراضی و غضب' غرض ہر طرح کی ظاہری باطنی مصائب و آلام' تمام دنیوی اور اخروی رنج و خوف سے عافیت اور حفاظت کی دعا کرتا ہے۔

عافیت و امن کے جامع مفہوم کو نظر میں رکھ کر غور کیجیے کہ جو شخص اس مفہوم میں اللہ سے واقعی

عافیت کا طالب ہے' وہ حقیقت میں اپنی عاجزی' بے بسی' تذلل اور بے کسی کا گہرا احساس رکھتا ہے اور ہاتھ اٹھا کر اپنے اس احساس عجز کا اظہار کرتا ہے کہ اے پروردگار' میں ہر ہر لمحے تیری عنایت توجہ اور رحم و کرم کا محتاج ہوں۔ تیرا کرم نہ ہو تو میں ایک سانس بھی نہیں لے سکتا۔ تیرا کرم نہ ہو اور تو نہ بچائے تو اپنے بل بوتے پر میں ہرگز کسی بڑی یا چھوٹی مصیبت سے نہیں بچ سکتا۔ تیری عنایت نہ ہو تو میں اپنی جان اور اپنے جسم کو کسی ظاہری اور باطنی آفت و مصیبت سے ہرگز نہیں بچا سکتا۔ میں انتہائی عاجز' بے بس اور سراپا احتیاج ہوں' دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ یہی کیفیت و احساس' شان بندگی ہے اور یہی کمال عبدیت ہے اور یہی بندے سے اللہ کو مطلوب ہے۔ اسی لیے بندے کی یہ دعا کہ پروردگار دنیا اور آخرت میں سلامتی اور عافیت عطا فرما' بندے کی وہ دعا ہے جو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اس دعا کی توفیق اس بندے کو نصیب ہو سکتی ہے جس کو اپنے عجز و تذلل کا واقعی احساس ہو اور ایسا ہی بندہ خدا کی رحمت و نوازش بیکراں کا مستحق ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو اللہ کے رسولؐ نے اپنے لفظوں میں یوں واضح فرمایا کہ تم میں سے جس کے لیے دعا کا دروازہ کھل گیا' یعنی دعا کرنا نصیب ہو گئی' اس کے لیے اللہ کی رحمت و کرم کے دروازے کھل گئے۔

لہٰذا ہر بندہ مومن کو رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ جیسی جامع دعا کو اپنے روز مرہ معمول کا حصہ بنا لینا چاہیے۔ (محمد یوسف اصلاحی)

وضاحت

گذشتہ ماہ "رسائل و مسائل" کے تحت تینوں سوالات کے جواب مولانا عبدالمالک نے تحریر فرمائے تھے۔ مولانا کا مکمل نام شائع ہونے سے سہواً رہ گیا۔ (ادارہ)

گذشتہ ماہ کے اشارات کا انگریزی ترجمہ جماعت اسلامی کے ویب سائیٹ

www. Jamaat.Org

پر ملاحظہ کیجیے۔ (ادارہ)

حضرت ابو موسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :
وہ شخص جو اپنے رب کو یاد رکھتا ہے' اور وہ جو یاد نہیں رکھتا' دونوں کی مثال ایسی
ہے جیسے ایک زندہ اور دوسرا مردہ (بخاری)۔

9- Mehran Heights GC-1 Block 8
Main Clifton Road, KARACHI.

Our New Phone Nos. : 5831494 - 8532850 - 5832901
5832902 - 5866548
Fax: 9221 - 5833180

کتاب نما

اصول الحدیث، مصطلحات و علوم (جلد اول)، ڈاکٹر خالد علوی۔ ناشر: الفیصل، اردو بازار، لاہور۔
صفحات: ۸۱۵۔ قیمت: ۳۷۵ روپے۔

امت کو جن علوم میں امتیاز حاصل ہے ان میں اصول الحدیث یا مصطلح الحدیث سرفہرست ہے۔ اس امت نے قرآن پاک کو تو (جس کے الفاظ وحی پر مشتمل تھے) لفظاً محفوظ کیا، سینوں میں بھی اور صحیفوں میں بھی۔ اسی طرح حدیث کو، جس کا مضمون آپؐ پر وحی کیا گیا، اسے بھی آپؐ سے معناً اور عملاً پوری طرح محفوظ کیا گیا اور اکثر جگہ لفظاً بھی محفوظ کر لیا گیا۔ یہ کارنامہ محدثین نے انجام دیا جو مسانید، جوامع، سنن اور معاجم کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

اصول الحدیث یا علوم الحدیث ان قواعد و ضوابط کا نام ہے جس کے ذریعے حدیث رسولؐ، اس کی اقسام و انواع کی پہچان ہوتی ہے اور سند اور متن یا راوی اور مروی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ علوم الحدیث یا علم مصطلح الحدیث بڑا وسیع علم ہے۔ یہ علم، احادیث کی جانچ پرکھ اور نقد و جرح کے لیے میزان کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح صرف و نحو کے بغیر عربی زبان میں ایک انسان میں بصیرت پیدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح اس علم کے بغیر حدیث کی حیثیت کے بارے میں گفتگو نہیں کی جا سکتی۔

الحمدللہ اب بھی دنیا میں علوم القرآن اور علوم الحدیث کے ماہرین کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ ان ماہرین میں سے ایک ممتاز اور ذہین و فطین علمی شخصیت ڈاکٹر خالد علوی صاحب کی ہے جو علمی دنیا میں نمایاں مقام پیدا کر چکے ہیں۔ انھوں نے حدیث رسولؐ کے موضوع پر گراں قدر کام کیا ہے۔ پہلے حفاظت حدیث کے موضوع پر ایک عمدہ کتاب پیش کی۔ اب علوم الحدیث پر ان کی تازہ کتاب آئی ہے جو فکری و علمی گہرائی اور گیرائی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس موضوع پر اردو زبان میں جو کتابیں سامنے آئی ہیں، یہ موسوعہ بلاشبہ ان سب سے فائق ہے۔ یہ کتاب اپنی جامعیت، اسلوب بیان اور انداز تحقیق کے لحاظ سے جلیل القدر اور عظیم الشان کوشش ہے۔ کوئی بات حوالے کے بغیر نہیں ہے۔ بلاشبہ اصول حدیث کے اردو ذخیرے میں یہ ایک خوب صورت اضافہ ہے۔

کتاب کے آغاز میں "علم الحدیث اور اس کا ارتقا" کے عنوان سے بڑی عمدہ بحث کی گئی ہے۔ صحابہ

کرامؓ کی احتیاط، خلفاے راشدین حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ اور ام المومنین حضرت عائشہؓ کے اقوال سے گفتگو کا آغاز کیا گیا اور پھر بات کو تکمیلی مرحلے تک پہنچانے کے بعد اس موضوع پر اب تک جو اہم کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کا تعارف بھی پیش کر دیا ہے۔ نیز اس علم کی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار کا درست اور محققانہ انداز میں تعین کیا گیا ہے۔ اس کے بعد علم حدیث کی اصطلاحات، اقسام اور اصول حدیث کے مختلف مباحث پر، جنھیں عموماً مختصراً بیان کر دیا جاتا ہے، سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس طرح بحث کے تمام گوشے واضح ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب لکھ کر ایک گراں قدر علمی خدمت سرانجام دی ہے۔ یہ کتاب ان شاء اللہ علما اور طلبہ کے لیے نور نظر اور سرور قلب ثابت ہو گی، اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور یہ علوم حدیث کی اشاعت و توسیع میں اہم کردار ادا کرے گی۔ **(مولانا عبدالمالک)**

شیخ ایاز کے آخری دس سال، مرتبہ: محمد موسیٰ بھٹو۔ ناشر: سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، ۱۱۸۶ پیپلز کالونی، لطیف آباد، نمبر ۴ بی، حیدر آباد۔ صفحات: ۱۱۲۔ قیمت: ۳۰ روپے۔

سندھ کے معروف دانش ور، شیخ ایاز سیکولرازم، مذہب بیزاری اور آزاد خیالی کے دل دادہ و علم بردار اور مبلغ تھے۔ وفات سے تقریباً دس برس پہلے اللہ تعالیٰ نے انھیں ہدایت عطا کی۔ ان پر اللہ کی وحدانیت، ایمان و یقین اور حق و صداقت کا انکشاف ہوا اور وہ خدا پرستی کے راستے پر گامزن ہوئے جس نے ان کے دل و دماغ کو منور کر دیا۔ زیر نظر کتاب سے ان کی قلب ماہیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے سندھی زبان میں حمدیہ دعاؤں کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔ یہ کتاب ان کی دعاؤں کے انتخاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے تعارف میں سندھ کی معروف ادبی اور روحانی شخصیت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے لکھا ہے کہ ان دعاؤں میں جہاں موصوف نے اپنی ذات کی مکمل نفی اور عاجزی سے اللہ کی کبریائی اور عظمت بیان فرمائی ہے اور اس کی بارگاہ میں دل کی گہرائیوں سے ہدایت کے لیے رہنمائی طلب کی ہے اور ایمان و اسلام کی راہ پر استقامت سے گامزن ہونے کے لیے اضطراب اور دل کے درد سے اللہ کو پکارا ہے، وہاں دعاؤں میں اسلامی فکر، فلسفہ اور حضور اکرمؐ کی تعلیمات کو بھی احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔ دعاؤں کے مترجم اور اس کتاب کے مرتب محمد موسیٰ بھٹو نے شیخ ایاز کے آخری دس سالوں میں ان سے رابطہ رکھا جس کی تفصیل کتاب میں ان کے بعض مضامین سے ملتی ہے۔ مرتب کے نام شیخ مرحوم کے متعدد خطوں کے عکس بھی شامل کتاب ہیں۔

محمد موسیٰ بھٹو بتاتے ہیں کہ شیخ ایاز سے آخری ملاقات میں محسوس ہوا کہ انھیں اس بات کا سخت افسوس تھا کہ سندھی نوجوانوں میں اسلام کے بارے میں پیدا شدہ غلط فہمیاں دور کرنے اور نئی نسل کا اسلام

پر اعتماد بحال کرنے کے لیے انھیں جو کردار ادا کرنا چاہیے تھا' اپنی مسلسل بیماری اور غیر معمولی جسمانی کمزوری کی وجہ سے وہ مطلوبہ کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ انھیں حسرت تھی کہ کاش انھیں حق و صداقت اور اسلامی فکر سے آشنائی صحت و توانائی کے دور میں ہوتی تو وہ اسلامی نظریے کے فروغ کے لیے اپنی توانائیاں صرف کر دیتے۔ یہ چیز دور حاضر کے نام نہاد ترقی پسند دانش وروں کے لیے فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ کا درجہ رکھتی ہے۔

دین و شریعت کی طرف شیخ ایاز کا رجوع' اسلامیان سندھ کے لیے باعث مسرت تھا کیوں کہ مرحوم ایک ممتاز شاعر و ادیب اور نامور دانش ور تھے اور ان کے (دور "تاریکی" کے) افکار نے ہزاروں سندھی نوجوانوں کو متاثر (گمراہ) کیا تھا۔ خود انھیں اس کا احساس تھا' چنانچہ انھوں نے زیر نظر دعاؤں میں' حضور باری تعالیٰ میں اعتراف کیا ہے کہ میں گمراہی کی کھائی میں گرا ہوا تھا' تو نے مجھے سیدھی راہ دکھائی۔ میں نے بے راہ روی کی زندگی گزار کر بڑا جرم کیا ہے۔ اب تو مجھے اتنی مہلت عطا کر کہ میں اپنے گناہوں کے ازالے کے لیے کچھ کر سکوں۔

محمد موسیٰ بھٹو بتاتے ہیں کہ شیخ ایاز کی وفات کے بعد' ان کی شخصیت اور فکر پر شائع ہونے والی درجن بھر کتابوں اور بیسیوں اردو اور انگریزی مضامین میں ان کی نئی اسلامی فکر' اسلامی جذبے اور اسلامی کردار سے بالکل صرف نظر کیا گیا ہے' بلکہ ان کے پرانے ساتھی اور بعض نام نہاد ترقی پسند (رسول بخش پلیجو وغیرہ) ان کی جاہلی فکر کو بڑے پیمانے پر شائع کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس مقصد کے لیے حکومت پر دباؤ ڈال کر' ان سے شیخ مرحوم کی "دور تاریکی" کی گمراہ کن ضبط شدہ کتابوں سے پابندی ختم کرا دی ہے اور مزید افسوس ناک بات یہ ہے کہ حکومت ان کتابوں کو (جن کی تحریر کو شیخ ایاز نے اپنی گمراہی کا ثبوت اور اپنا جرم قرار دے کر' آخر عمر میں خدا کے حضور معافی کے خواست گار ہوئے) شائع کرنے کے لیے دس لاکھ روپے کی مالی مدد دینے کا اعلان کر چکی ہے۔ ہمارے خیال میں شیخ ایاز کے دوست نما دشمنوں کے لیے یہ "ایک سلسلہ روزگار" تو ہے مگر یہ مرحوم کی روح کو ایذا پہنچانے کے مترادف ہے۔ ممکن ہے ان میں سے بعض کو' مرحوم کی طرح' آخر عمر میں احساس زیاں سے دوچار ہونا پڑے۔

آزاد خیالی' لبرل ازم اور نام نہاد ترقی پسندی کے سراب کا شکار ہونے والے حضرات و خواتین کے لیے یہ کتاب' ایک اچھا ہدیہ ہو سکتی ہے____ شاید بصیرت و موعظت کا باعث ہو۔ (رفیع الدین ہاشمی)

نصیحت الملوک' امام غزالیؒ' ترجمہ: ڈاکٹر سمیع اللہ قریشی۔ ناشر: فضلی سنز لمیٹڈ' اردو بازار' کراچی۔ صفحات: ۱۵۹۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

حضرت امام غزالیؒ سے بعض جعلی کتابیں بھی منسوب ہیں لیکن زیر نظران کی آخری زمانے کی' اپنی تصنیف ہے۔ امام علیہ الرحمہ نے اس کتاب کو سلجوقی سلطان محمد بن ملک شاہ کے لیے تحریر کیا تھا۔ جس کے اسلاف دین کے محافظ تھے اور خود اس نے بھی ۲۰ سال تک بڑی قابلیت اور کامیابی سے حکومت کی۔ کتاب کا پہلا حصہ بنیادی اعتقادی مسائل اور شرعی فرائض سے متعلق ہے' اور دوسرا: بادشاہوں' وزیروں اور حکومتی اہل کاروں کی سیرت اور فرائض پر ہے۔ امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ جب تک حکمران کے اسلامی عقائد مضبوط نہیں ہوں گے اسلامی طرز کی حکمت عملی نہیں چل سکتی۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ عدل و انصاف کا منبع خود حکمران ہیں اور اس کے کردار کا اثر سلطنت اور اہل کاروں پر ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اسلام میں اخلاقیات اور سیاسیات جدا نہیں۔

فاضل مترجم ڈاکٹر سمیع اللہ قریشی متعدد ممالک میں پاکستان کے سفیر رہے ہیں۔ دور حاضر میں اس قدیمی کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف کہتے ہیں کہ ہر قوم کے کلچر کی کچھ بنیادی قدریں ہوتی ہیں۔ غزالیؒ کے دور کے کلچر کی قدریں آج خود پاکستانی کلچر کی بنیادیں ہیں' جیسے خوف خدا' عاقبت میں محاسبے کا ڈر' طاقت کو عارضی سمجھنا وغیرہ۔ یہی قدریں طاقت کے نشے کو بریک لگاتی ہیں۔ ڈاکٹر قریشی کے خیال میں غزالیؒ نے جس موضوع کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے وہ عدل و انصاف ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا بیشتر حصہ اس حدیث نبویؐ کی تفصیلی و تشریح ہے: اَلْمُلْكُ يَبْقٰى مَعَ الْكُفْرِ وَلَا يَبْقٰى مَعَ الظُّلْمِ۔ امام غزالیؒ نے حکمرانوں کے سخت ترین محاسبے کا تصور دیا ہے۔ ان کے خیال میں معاشرے میں بدعنوانی (کرپشن) یا دیانت داری کا انحصار حکمران کے کردار پر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر حکمران دیانت دار ہوں گے تو عوام میں دیانت داری ہو گی۔ یہ امر کہ معاشرے میں بدعنوانی' بدکاری' رشوت وغیرہ رائج ہیں یا نہیں؟ حکمرانوں کے طرز عمل پر منحصر ہوتا ہے۔ غزالیؒ نے حسب موقع قدیم انداز کی حکایتوں کو مختلف نکات کی وضاحت کے لیے استعمال کیا ہے اور قرآن و حدیث کے حوالے بھی جگہ جگہ دیے ہیں۔

امام رحمہ اللہ کی یہ کتاب' آج بھی عوام و خواص کے لیے ایک اہمیت رکھتی ہے۔ صوری محاسن سے آراستہ' یہ کتاب اعلیٰ معیار اشاعت پر پوری اترتی ہے۔ (د-ع)

قرآن' اہل کتاب اور مسلمان' محمد رضی الاسلام ندوی۔ ناشر: ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی' علی گڑھ۔ صفحات: ۲۹۴۔ قیمت: ۷۰ روپے۔

یہودی' عیسائی اور مسلمان بڑے بڑے وحدانیت پرست (monotheistic) گروہ ہیں۔ ذات باری کی صفات و کمالات کے بارے میں ان میں اختلاف ہے تاہم اس کے وجود پر تینوں گروہ ایمان رکھتے

ہیں۔ دنیا میں آبادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ عیسائی ہیں، پھر مسلمان ہیں۔ یہودی دو کروڑ سے زائد نہیں۔ کئی ممالک خصوصاً مغربی ممالک میں، مکالمہ بین المذاہب (inter-faith dialogue) کے ادارے قائم ہیں۔ ان اداروں میں دوسرے مذاہب کے بارے میں حقیقی معلومات حاصل کرنے اور باہمی فاصلے اور دوریاں پاٹنے یا کم کرنے کی جدوجہد کی جاتی ہے۔ اس پس منظر میں یہود و نصاریٰ کے بارے میں حقائق سے باخبر رہنا ضروری ہے۔

محمد رضی الاسلام ندوی ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کے رفیق ہیں، مذکورہ کتاب کے دیباچے میں سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہود و نصاریٰ کے حالات پر انگریزی، عربی اور اردو وغیرہ میں بہت سی کتابیں موجود ہیں، مگر ان میں تاریخی پہلو غالب ہے، عبرت و موعظت کے پہلو پر کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ ضرورت تھی کہ کوئی ایسی کتاب مرتب کی جائے جس میں تاریخی پہلو کی طرف اشارات ہوں، البتہ ان پہلوؤں کو خاص طور پر ابھارا گیا ہو جن سے مسلمانوں کو عبرت و نصیحت حاصل ہو اور وہ ایمان و یقین سے سرشار ہو کر پوری زندگی کو اطاعت الٰہی کے تابع بنا دیں اور اعمال صالحہ سے اسے آراستہ کریں۔

اس کتاب میں پہلے تو بنی اسرائیل پر اللہ کے انعامات، میثاق، یہود کی گمراہی اور سزائیں قرآنی حوالوں سے زیر بحث لائی گئی ہیں، پھر نصاریٰ کے عقائد، تاریخ اور اختلافات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ موضوع کے حوالے سے قرآن کی آیات اور ترجمہ بھی شامل ہے۔ مصنف نے قدما میں، **طبری، ابن کثیر، کشاف، رازی** اور دور جدید میں، **تفسیر ماجدی، تفہیم القرآن، تدبر قرآن** اور **فی ظلال القرآن** سے استفادہ کیا ہے۔ اہل کتاب کے نقش قدم پر چلنے کی ممانعت، ایک اہم باب ہے اور غیر مسلموں کی اندھا دھند پیروی کرنے والوں کے لیے خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

اپنے طرز اور اسلوب کی بدولت یہ عبرت و موعظت کی کتاب بن گئی ہے۔ تاریخی موضوعات پر اس قسم کے ٹھوس تحریری کام کا ایک مقام ہے، تاہم ایسی کتابوں میں دور حاضر کے اہل کتاب کی اسلام دشمنی اور اسلامی احیا کے خلاف ان کی سازشوں کا ذکر بھی کرنا ضروری ہے۔ علما و طلبا کے لیے یہ ایک مفید کتاب ہے۔ **(محمد ایوب منیر)**

ہمدرد صحت، اشاعت خاص ''صحت مند بڑھاپا''۔ مدیر اعلیٰ: حکیم محمد سعید۔ ناشر: ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی۔ صفحات: ۱۳۶۔ قیمت: ۳۰ روپے۔

اس مفید مجموعہ مضامین میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بڑھاپے کو صحت اور تندرستی کے ساتھ کیسے گزارا جا سکتا ہے اور اس کے لیے غذا' عادات زندگی' ورزش اور علاج معالجے کے ضمن میں کیا کچھ کرنا چاہیے؟ اگر ہم اپنے طرز زندگی کو تبدیل کریں' اسلامی اصولوں کی پابندی کریں' یعنی جسم اور ماحول کی صفائی' مناسب اور متوازن نیند' دوپہر کو مختصر قیلولہ' رات جلد سوئیں اور صبح جلد بیدار ہوں (حکیم محمد سعید صاحب کے اپنے مختصر مضمون "صحت اور اسلام" میں ان پہلوؤں کی عمدگی سے وضاحت کی گئی ہے) تو بڑھاپے میں بھی انسان صحت مند زندگی کی نعمتوں سے بہ خوبی مستفید ہو سکتا ہے۔ اس مجموعے میں ورزشوں کے طریقے ہیں' غذائی ہدایات اور احتیاطیں بھی ہیں اور بڑھاپے کے بارے میں جدید سائنسی تحقیق بھی اور مزید بھی بہت کچھ۔ ایک دلچسپ اور معلومات افزا رسالہ۔ (ر-ہ)

نفس انسانی کے قرآنی تصورات' مرتبہ: ظفر آفاق انصاری۔ مترجم: عزیز ابن الحسن۔ ناشر: عالمی ادارہ فکر اسلامی' اسلام آباد۔ صفحات: ۱۱۰۔ قیمت: درج نہیں۔

یہ کتاب ان چھ مقالات کے تراجم پر مشتمل ہے جو عالمی ادارہ فکر اسلامی اور گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ نفسیات کے اشتراک سے ۱۹۸۸ میں منعقدہ ایک سیمی نار میں پڑھے گئے۔ مترجم کے بقول: "یہ ترجمہ لفظی نہیں لیکن اسے اصل سے دور بھی نہیں جانے دیا گیا۔ جہاں ناگزیر ہوا وہاں انگریزی جملے کا مفہوم (صرف چند ایک مقامات پر) کھول کر بھی بیان کیا گیا ہے"۔ ترجمے کو اصل سے قریب تر رکھنے میں مقالہ نگاروں کے علاوہ جناب محمد سہیل عمر نے بھی مترجم کی کافی مدد کی ہے۔ ترجمے کی زبان اگرچہ صاف ستھری ہے لیکن بعض جگہوں پر مشکل الفاظ کے بجائے سادہ اور آسان الفاظ لائے جا سکتے تھے۔

مقالہ نگاروں کے نام اور مقالوں کے عنوانات یہ ہیں: ابصار احمد (نفس انسانی کے قرآنی تصورات)' نعمانہ حمید (اسلامی عرفان اور فلسفے کی روایت)' پروفیسر منظور الحق (قلب: نفس انسانی کا مرکز)' ڈاکٹر مہ نظیر ریاض (قرآن حکیم میں فرد اور معاشرہ)' پروفیسر عبدالحئی علوی (ذہنی صحت کا قرآنی تصور) قاضی شمس الدین الیاس (مسلم مذہبیت کے ابعاد' چند تجاویز)--- مقالہ نگاروں نے بڑی محنت سے نفس انسانی کو' پہلے دنیا کے عظیم مفکروں اور فلسفیوں کے افکار کی روشنی میں اور پھر قرآن حکیم کے سیاق و سباق میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ نکتے جنھیں دنیا کے عظیم فلسفی اور حکیم' (افلاطون' ارسطو' ڈیکارٹ اور فرائڈ وغیرہ) سمجھنے اور سمجھانے میں عمریں گزار کر چلے گئے اور ہر قدم پر الجھتے اور الجھاتے رہے' قرآن حکیم انھیں اتنے سادہ اور آسان انداز سے سلجھا دیتا ہے کہ کوئی مشکل' مشکل نہیں رہتی۔ قرآن کے دلائل سن کر قاری یوں فرحت اور آسودگی محسوس کرتا ہے جیسے وہ کسی خطرناک بھنور سے نکل کر

اچانک کنارے پر آ کھڑا ہوا ہو۔

ان مقالات میں روح کی ماہیت، نفس انسانی کی حقیقت اور قلب کے دائرہ کار پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ان موضوعات پر نہ صرف قدیم، بلکہ جدید نفسیات میں استعمال ہونے والی اصطلاحات سے بھی کام لے کر بات کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

روح، انسانی جسم میں ربانی عنصر کی علامت ہے۔ نفس، انسانی شخصیت اور ذات کا دوسرا نام ہے، جبکہ قلب جسم کے اندر قوت عاملہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک روح کا تعلق ہے، اس کا اصل مسکن، عالم ارواح ہے۔ یہ کسی جسم کے لیے مخصوص ہو کر زمانی اور مکانی زندگی کی شکل میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ قرآن حکیم نفس انسانی کی ابتدا تین جہتیں بیان کرتا ہے (۱) نفس امارہ انسان کو بدی کی طرف راغب کرتا ہے۔ یہ شہوانی اور آتشی جذبات کا ماخذ ہے۔ اس مرحلے پر ذات، لالچ، خود غرضی اور طمع کی صورت میں انسان کو مادی مقاصد کے حصول کی کوشش میں لگا دیتی ہے۔ (۲) نفس لوامہ ملامت گر ہے۔ یہ نیکی اور برائی کے درمیان فرق سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ اخلاقی شعور کی بیداری کا مقام ہے۔ یہاں انائے عقلی تشکیل پذیر ہوتی ہے، لیکن یہ انائے عقلی حقیقت مطلقہ کا ادراک نہیں کر سکتی۔ (۳) نفس مطمئنہ کے درجے پر، نفسی جذبات، اطمینان اور خاموشی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں انسان کی شخصیت، وحدت کے براہ راست ادراک کے طفیل توحید کے خالص نظریے تک رسائی حاصل کر لیتی ہے۔ باطنی تضادات ختم ہو جاتے ہیں اور ابدی ہم آہنگی اور یگانگت کی صورت میں کامل سکون حاصل ہوتا ہے، مثلاً سورہ الفجر (۲۷ تا ۳۰)۔ نفس کے اسی درجے کو "قلب" کا نام دیا گیا ہے۔ قلب، وجود کی الوہی جہت کی دہلیز ہے۔ یہ وہ قوت عاملہ ہے جو اعلیٰ درجے پر وہی کام انجام دیتی ہے جو ادنیٰ درجے پر آنکھ، کان اور ناک اور دیگر اعضائے حسی انجام دیتے ہیں۔ یہ جسم کا مرکز ہونے کے اعتبار سے باقی جسم کے مقابلے میں ماورائی جہت رکھتا ہے، مثلاً سورۃ الحج (۴۶)۔

نفس کے ان قرآنی درجات کا ہر مقالہ نگار نے بہ تصریح ذکر کیا ہے۔ یہ تمام مضامین اور خود مرتب کا کتاب پر مقدمہ، سب مل کر نفس انسانی کو قرآنی تناظر میں سمجھنے میں بڑے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے انسان کے مقصد تخلیق اور اس کی باطنی دنیا کے متعلق بڑی قیمتی باتیں سامنے آتی ہیں۔ قاری محسوس کرتا ہے کہ ایک کامیاب اور خدا کی مکمل رضا کی حامل زندگی گزارنے کے لیے قرآن ہی بہترین رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

ترجمے کی زبان صاف اور ستھری ہے۔ کتاب کا ظاہر خوب صورت ہے اور طباعت کی غلطی کہیں نظر نہیں آتی۔ بہرحال ایک بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس کتاب سے زیادہ تر وہی لوگ صحیح استفادہ کر سکتے ہیں جنھیں قرآن کا فہم، عربی زبان پر دسترس اور فلسفہ کے رموز سے واقفیت حاصل ہے۔

(سعید اکرام)

مطبوعات موصولہ

☆ **تحریک پاکستان اور بلوچستان** (توضیحی کتابیات، ۱۹۴۰ تا ۱۹۴۷)، پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ ناشر: بولان بک کارپوریشن، زمانہ سٹریٹ، سرکی روڈ، کوئٹہ۔ **صفحات:** ۱۱۸۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔ [ایسی کتابوں کی وضاحتی کتابیات اور ایسے مضامین کی فہرست، جن میں تحریک آزادی اور قیام پاکستان میں بلوچستان کے کردار کا ذکر ہے]۔

☆ ماہنامہ **عکس صادق**، غالب نمبر، مدیر: گوہر ملسیانی۔ گوہر ادب پبلی کیشنز، مظہر فرید کالونی، صادق آباد۔ **صفحات:** ۲۱۶۔ قیمت: ۲۰ روپے۔ [۱۹۹۷ء میں ولادت مرزا غالب کے دو سو سال پورے ہوئے۔ غالب کے دلدادگان کے لیے، اس مناسبت سے ان پر تنقیدی و تحقیقی مقالوں اور نظموں کا ایک عمدہ مرقع]۔

☆ **آدم خوابیدہ**، حنیف ساجد۔ پتا: وارڈ ۲، مکان ۹۰، بھلوان، سرگودھا۔ **صفحات:** ۱۱۲۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔ [مولف کا تیسرا مجموعہ غزلیات، اکابر نقادوں کی تحسین آمیز آرا کے ساتھ]۔

☆ **یوسف کلہ کاجانا**، یوسف ثانی۔ ناشر: شیلڈ پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۱۲۲۰۷، ڈیفنس اتھارٹی، کراچی، ۷۵۵۰۰۔ **صفحات:** ۱۳۴۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔ [طنزیہ مزاحیہ مضامین اور دلچسپ انشائیوں کا مجموعہ۔ آرٹ پیپر پر، اشاعت خاص، کاوش و اہتمام سے]۔

☆ ماہنامہ **القاسم**، خالق آباد، زڑہ میانہ، ضلع نوشہرہ، صوبہ سرحد۔ زیر سرپرستی: مولانا عبدالقیوم حقانی۔ مدیر: حافظ حبیب الرحمٰن۔ **صفحات:** ۴۸۔ قیمت: ۱۰ روپے، سالانہ: ۱۲۰ روپے۔ ["عالمی اسلامی تحریکوں اور جامعہ ابوہریرہ کا ترجمان"۔ مختصر اور معلومات افزا مضامین، خصوصاً طالبان افغانستان کے بارے میں]۔

☆ **الف سے اٹکھیلیاں**، محمد حمید شاہد۔ ناشر: القلم دارالاشاعت، ۱۱ شان پلازا، بلیو ایریا، اسلام آباد۔ **صفحات:** ۱۲۸۔ قیمت: ۹۰ روپے۔ [سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی صورت حال پر، تحریفانہ انداز کے طنزیہ، مزاحیہ ادبی نثرپاروں کا عمدہ مجموعہ]۔

☆ **ناموس رسالت پر فتنہ وحید الدین خان کی یلغار**، محمد طاہر رزاق۔ ناشر: عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، ۵، حسین سٹریٹ، مسلم ٹاؤن، لاہور۔ **صفحات:** ۱۶۔ قیمت: درج نہیں۔
["فتنہ وحید الدین، فتنہ قادیانیت کا تسلسل" ہے، جس کا مقصد "مسلمانوں کے دلوں سے محمدؐ اور محمدؐ کے جہاد کو نکالنا" ہے۔ "وحید الدین خاں اور قادیانی جماعت کے طریقہ واردات میں مطابقت اور مماثلت" ہے۔ "دونوں کا مشن ایک ہے"]۔

مدیر کے نام

اللہ داد نظامی 'جھوک نواز' وہاڑی

اشارات کے موضوع کی یکسانیت اب کھٹکنے لگی ہے۔ معیشت' آئین اور خارجہ پالیسی سے ہٹ کر کم ہی لکھا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے موضوعات میں بڑی وسعت رہی ہے۔ تحریک کے داخلی مسائل' انسانیت کو درپیش چیلنج' انسان کو انفس و آفاق کی آیات کی طرف متوجہ کرنا' موضوعات میں تنوع اور وسعت ہو لیکن ایک بنیادی فکر سے مربوط ہونے کا قرآنی انداز رہے۔

رہنمائے تربیت پر آپ کے تبصرے نے رائے خراب کر دی تھی' اب دیکھنے کا موقع ملا' کتاب بڑے کام کی ہے اور ہمارے لٹریچر میں جس قسم کی کتب کی کمی ہے اس میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ ہمارا اصل مسئلہ ہی یہ ہے کہ ہم انسانی وسائل کی تعمیر' ان کے استعمال اور ان کے اضافے' اور طویل اور قلیل مدت کی منصوبہ بندی کے امور میں ماہر نہیں ہیں۔ اس طرح کی چیزوں کا کھلے دل سے استقبال ہونا چاہیے۔

سید زین العابدین 'کراچی

اگر آپ کے رسالے میں ملک اور ملک کے مختلف طبقات کو درپیش مسائل اور چیلنجوں کے بارے میں معیاری تحریریں شائع ہوں تو افادیت میں اضافہ ہو گا۔ مولانا مودودی مرحوم نے تنقیحات میں جس طرز کے مضامین لکھے ہیں اس طرح کے نئے موضوعات اس دور میں بہت زیادہ ہیں' مثلاً لسانی قومیت' کوٹا سسٹم اور اسلامی مساوات ' عراقی جارحیت کے اثرات' خواتین کے لیے اسلامی معاشرے میں حجاب کے ساتھ امکانات وغیرہ وغیرہ۔

سید طاہر علی 'امریکہ

افسوس کہ ساٹھ سال کی مدت گزرنے کے باوجود **ترجمان القرآن** کا انگریزی ترجمہ دستیاب نہیں۔ امریکہ' یورپ اور دیگر ممالک کے تحریکی افراد' خاص طور پر نوجوانان اس سے کوئی استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس بعض دوسرے رسائل جن کی اشاعت کو چند ہی برس گزرے ہیں' باقاعدگی سے انگریزی میں شائع ہو رہے ہیں۔ انگریزی کو دنیا کی سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ آپ اس طرف توجہ کریں۔

وقار احمد 'کراچی

اشارات بھرپور' جامع اور سیر حاصل ہوتے ہیں۔ "معاشی ترقی کا نصب العین" (ستمبر ۹۸) میں ہم جیسے ممالک کے لیے مغرب کی معاشی حکمت عملی خوب اچھی طرح واضح کی گئی ہے۔ ہمیں اپنی ضروریات اور حالات کے تحت

آزاد ذہن سے اپنے نظریات کے مطابق منصوبہ بندی کرنا چاہیے۔ تب ہی حقیقی' معاشی خوش حالی حاصل ہو گی۔ لیکن غالباً اسلامی نقطہ نظر سے معاشی ترقی کو نصب العین نہیں ہونا چاہیے۔

انعام الحق ' دیر' سرحد

پانچ سال سے رسالے کا مستقل قاری ہوں۔ یہ ایک اعلیٰ' علمی اور فرقہ واریت سے بالا رسالہ ہے۔ ہر ماہ اشارات بڑے غور سے پڑھتا ہوں۔ جولائی کے اشارات (ایٹمی صلاحیت) نے رگوں میں مزید خون پیدا کیا۔ مدیر محترم اپنی مصروفیات کے باوجود دنیا بھر کے رسائل و جرائد کا مطالعہ کر کے ہمارے سامنے عطر اور خلاصہ پیش کر دیتے ہیں۔ یقیناً موجودہ ادارت میں' رسالے نے نئے انداز سے ترقی کی ہے۔

ڈاکٹر خان محمد صابری ' جھنگ

ترجمان میں معمولی سی غلطی بھی بہت زیادہ کھٹکتی ہے۔ "دعوت کے نشان راہ" (اگست ۹۸) میں دادا کے انتقال کے وقت' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۵ سال لکھی گئی ہے' مستند روایات کے مطابق ۸ سال تھی۔

محمد عثمان ' لاہور

یوکراین کے بارے میں معلومات (ستمبر ۹۸) بہت دلچسپی سے پڑھیں۔ اس وقت ساری دنیا میں مسلمانوں میں عام بیداری ہے۔ کشمکش برپا ہے اور ہر جگہ جہاں ایک طرف "دنیا کے بیٹے" اپنے محدود مقاصد کے لیے دن رات ایک کر رہے ہیں' "آخرت کے بیٹے" جان ہتھیلی پر رکھ کر مصروف جہاد ہیں۔ ترجمان القرآن میں عالمی سطح پر اسلامی بیداری کی سرگرمیوں کی زیادہ موثر نمایندگی ہونا چاہیے' کمی محسوس ہوتی ہے۔

بدر منصور ' گوجرانوالہ

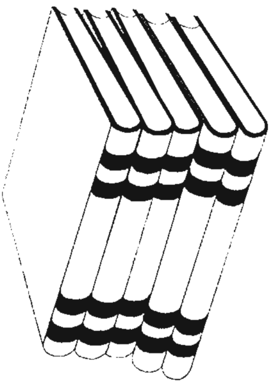
اطاعت رسولؐ کا شوق (ستمبر ۹۸) زیادہ ہی پسند آیا۔ حضرت ام سلمہؓ کے اشتیاق کی تصویر سامنے آگئی ہے۔ مولانا عبدالمالک اہم نکات کی طرف دل کش انداز سے توجہ دلاتے ہیں۔ اس وقت ہمارے معاشرے میں میرث کا جس طرح قتل عام ہو رہا ہے' سب کو نظر آتا ہے۔ اس پر جو وعید پیارے رسولؐ نے دی ہے ، رسولؐ کے نام لیواؤں کو شاید کچھ سوچنے پر مجبور کرے۔

اہم گزارش : **ترجمان القرآن** میں اشتہار دینے والے اداروں یا افراد سے معاملات میں کوئی نقصان ہو' تو **ترجمان القرآن** کے نمایندے اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ قارئین کو چاہیے کہ کوئی معاملہ کرنے سے پہلے تحقیقات کریں اور اپنی ذمہ داری پر معاملہ کریں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

جس بستی میں تین افراد موجود ہوں' وہ جماعت کا اہتمام نہ کرتے ہوں تو ان پر شیطان غالب آجاتا ہے۔ اس لیے تم نماز کے لیے جماعت کی پابندی اپنے اوپر لازم رکھو کیونکہ بھیڑیا ان بھیڑوں کو کھاجاتا ہے جو اپنے ریوڑ سے دور رہتی ہیں۔ (ابوداؤد)

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵- اے ذیلدار پارک' اچھرہ لاہور سے شائع کیا



خواتین کے لیے نادر تحفہ

"خوبصورت جہیز سیٹ"

پردہ ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

عصرِ حاضر میں اس موضوع پر لکھی جانے والی سب سے ممتاز کتاب جسے عالمِ اسلام میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو کم کتابوں کے نصیب میں آتی ہے۔ مختلف زبانوں میں اب تک اس کے کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک چکے ہیں۔

آسان فقہ ۔ محمد یوسف اصلاحی (حصہ اول، حصہ دوم)

باہمی اختلافات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس کتاب میں صرف وہی متفقہ عملی مسائل اور کتاب و سنت کی روح و منشا کے مطابق ان کے حل پیش کیے گئے ہیں جو عام زندگی میں پیش آتے ہیں۔

آدابِ زندگی ۔ محمد یوسف اصلاحی

اپنی زندگیوں کو اسلامی آداب سے بنانے اور سنوارنے کی آرزو رکھنے والوں کیلئے نادر تحفہ

راہِ عمل ۔ مولانا جلیل احسن ندوی

ہادیِ اعظم نبی اکرم ﷺ کے مبارک اقوال و افعال کی روشنی میں اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ڈھالنے کے لیے رہنما کتاب۔

حسنِ معاشرت اور اس کی تکمیل میں خواتین کا حصہ۔ محمد یوسف اصلاحی

ان خواتین کے لیے جو اپنے فرائض کے گہرے احساس، پرسوز جذبات اور مجاہدانہ کوششوں سے اس خاکے میں رنگ بھر سکتی ہیں۔

قیمت مکمل سیٹ -/800 روپے   رعایتی قیمت -/500 روپے

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

13-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور فون : -7669546 - 7664504 فیکس: -7658674

شو روم : - 10-چیمبر جی روڈ اُردو بازار لاہور

C.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE,